بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

فروری 2015

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ منتظم — آذر ریاض

مدیرِ اعزازی — امت الصبور

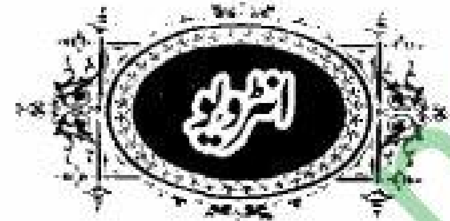
فلم، ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE















زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- روپے





فروری 2015

جلد 29 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2-61 بی پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ جمیل



شعاع کا فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اہلِ مغرب، جو مسلمانوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور عدم برداشت جیسے سنگین الزامات عائد کرتے رہے ہیں، فرانس میں پیش آنے والے حالیہ واقعہ نے انہیں ایک بار پھر موقع فراہم کر دیا ہے مسلمانوں کی کردار کشی کے لیے وہ سرگرم اور متحد ہو گئے ہیں۔ مغربی میڈیا اس مہم میں پیش پیش ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغام پندرہ سو سال سے دہر میں اجالا کر رہا ہے۔ آپؐ کی تعلیمات قیامت تک انسانیت کی راہوں کو روشن کرتی رہیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ اہلِ مغرب جانتے ہیں کہ ایک عام سا بے عمل مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا شر انگیز اظہار رائے کس سنگین اظہار عمل کو جنم دے سکتا ہے۔

یورپ کے اہلِ علم اور دانش وروں کو سوچنا چاہیے کہ آزادیٔ اظہار کے نام پر شر انگیزی کر کے وہ دنیا کو کس طرف لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں پر تنگ نظری اور بنیاد پرستی کا الزام لگانے والے کس انتہا پسندی اور تعصب کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

چالیس ملکوں کے سربراہان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے اور لاکھوں افراد نے ان کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ آزادیٔ اظہار کے ان نام و نہاد علم برداروں کے لیے خود ان کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس کا یہ تبصرہ بہترین جواب ہے۔

"آزادیٔ اظہار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی میری ماں کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرے تو اسے میرا گھونسا کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

آزادیٔ اظہار کی حدود نہ صرف مغربی میڈیا بلکہ ہمارے میڈیا کو بھی مقرر کرنا ہوں گی۔

اس شمارے میں،

- فرح بخاری کا مکمل ناول۔ شامِ خزاں طویل سہی،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ "یارم" تکمیل کے مراحل میں،
- لبنیٰ جدون، راشدہ رفعت اور سحر ساجد کے ناولٹ،
- سباہت عاصم، نظیر فاطمہ، فریدہ فرید اور کنیز نور علی کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ۔ یمنیٰ زیدی سے ملاقات،
- بیٹھا کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ نذیر کا تبصرہ،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

فروری کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔



خدایا تُو رحیم و مہربان ہے
تیرا لطف و کرم سب پر عیاں ہے

تُو ہے موجود ہر ذرے میں لیکن
تیرا پیکر نگاہوں سے نہاں ہے

تیرا مشکور ہے ایک ایک ذرّہ
تیرا ممنون یاں ہر انس و جاں ہے

کھِلے ہیں پھول تیرے اذن ہی سے
تیرے ہی حکم سے دریا رواں ہے

تُو ہی مالک ہے ہر اک شے کا مولا
زمیں تیری، تیرا ہی آسماں ہے

جسے بخشی ہے تُو نے اپنی رحمت
غموں کے درمیاں وہ شادماں ہے

نہیں ہے فکر پھر اس کو کسی کی
تیرا کلمہ اگر وردِ زباں ہے

شمیم فاطمہ



دل کی دُنیا میں ہے روشنی آپؐ سے
ہم نے پائی نئی زندگی آپؐ سے

کیوں نہ نازاں ہوں اپنے مقدر پہ ہم
ہم کو ایماں کی دولت ملی آپؐ سے

کل بھی معمور تھا آپؐ کے نور سے
ہے منوّر جہاں آج بھی آپؐ سے

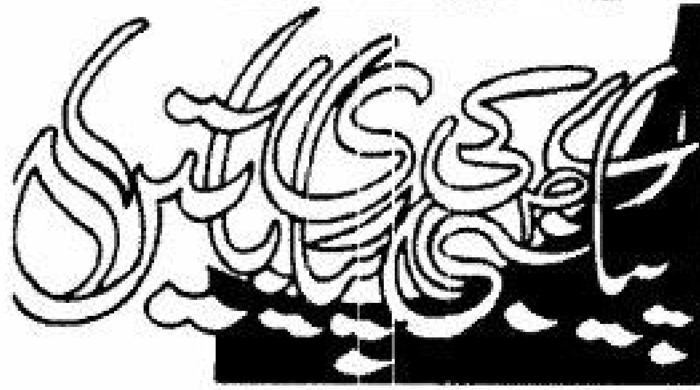
دُشمنوں پر بھی در رحمتوں کا کھُلا
راہ و رسمِ محبت چلی آپؐ سے

دل کا غنچہ چٹکتا ہے صلّی علیٰ
اپنے گلشن میں ہے تازگی آپؐ سے

ختم ہے آپؐ پر شانِ پیغمبری
یہ روایت مکمّل ہوئی آپؐ سے

ناصر کاظمی

ادارہ



عشاء کے بعد بات چیت کی کراہت

اس سے مراد وہ بات چیت ہے جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں جائز ہے اور اس کا کرنا اور چھوڑنا دونوں برابر ہیں۔ لیکن وہ بات جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں حرام ہو تو وہ اس وقت (عشاء کے بعد) زیادہ حرام اور زیادہ مکروہ ہو گی۔ لیکن بھلائی کی بات' جیسے علمی مذاکرہ' نیک لوگوں کی حکایت' عمدہ اخلاق کا تذکرہ' مہمان کے ساتھ اور کسی ضرورت مند وغیرہ کے ساتھ گفتگو کرنا' تو اس میں کوئی کراہت نہیں بلکہ یہ مستحب (پسندیدہ) ہے۔ اسی طرح کسی عذر یا سبب کی وجہ سے بات کرنے میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں جن کا میں نے ذکر کیا' ان پر صحیح حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ (یہ احادیث ملاحظہ ہوں)

حضرت ابوبرزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشائ سے پہلے سونے کو اور عشائ کے بعد بات چیت کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل : (1) عشائ سے قبل سونے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عشا کی نماز فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے اور عشائ کے بعد جائز بات چیت اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ اس سے سونے میں تاخیر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کے لیے تہجد یا فجر کے وقت اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے' اس صورت میں گویا نماز فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان عشا کی نماز کے فوراً بعد سو جائے تو اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ اس کی دن کی سرگرمیوں کا اختتام نماز پر ہو گا جو افضل ترین عمل ہے۔

(2) یہ بھی یاد رہے کہ جب عشائ کے بعد بات چیت ناپسندیدہ ہے تو دوسرے کام بھی' جن میں کوئی دینی فائدہ اور شرعی غرض نہیں ہے' مکروہ ہوں گے' جیسے کھیل کود' تاش بازی' شطرنج وغیرہ اور آج کل کی عالمی لعنت ٹیلی ویژن اور ویڈیو وغیرہ دیکھنا۔ یہ ساری چیزیں تو ویسے بھی حرام ہیں۔ عشائ کے بعد ان لغویات میں مصروف رہنا اور بھی زیادہ حرام ہو گا۔ اسی طرح امام نووی رحمتہ اللہ نے علمی مذاکرے وغیرہ کو جو جائز بلکہ مستحب قرار دیا ہے تو یہ بھی مشروط ہے بروقت نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ۔

پیش گوئی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عشا کی نماز پڑھائی۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا۔

"بھلا بتلاؤ تو سہی' یہ رات کون سی ہے؟ بے شک جو شخص آج روئے زمین پر زندہ ہے' صدی کے پورے ہونے تک وہ باقی نہیں رہے گا۔" (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل : (1) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آج کی رات کے بعد جو زندہ ہیں' وہ صدی کے راس (پورے ہونے یا سرے) پر باقی نہیں رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلی صدی ہجری کے اختتام تک وفات پا گئے۔ سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی

ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کا انتقال ایک سو دس ہجری میں ہوا یعنی آپ کے فرمان کے پورے سو سال بعد۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(2) اس میں عشاء کے بعد ضروری باتیں اور علم سے متعلق گفتگو کا جواز ہے۔

عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ چنانچہ آپ ان کے پاس تقریباً" آدھی رات کو آئے اور ان کو عشاء کی نماز پڑھائی ' (حضرت انس فرماتے ہیں) پھر ہمیں خطبہ دیا جس میں فرمایا۔
"سنو! بے شک بعض لوگ نماز پڑھ کر سو گئے اور تم جتنی دیر انتظار کرتے رہے ' برابر نماز ہی میں رہے۔" (بخاری)
فائدہ : اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز نصف رات تک مؤخر کی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کے لیے جاگنا بھی جائز ہے تاکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جا سکے۔ تیسری بات یہ کہ انتظار کی ساری مدت نماز میں شمار ہو گی اور اس حساب سے زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔

شوہر کی اجازت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو داخل ہونے کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل : (1) روزے سے مراد نفلی روزہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی طرح دیگر نفلی عبادات ہیں ' مثلاً" نفلی نماز اور تلاوت وغیرہ ' یہ سب کام خاوند کی موجودگی میں خاوند کی اجازت کے بغیر کرنے جائز نہیں۔

(2) اسی طرح خاوند کی رضامندی کے بغیر عورت کو گھر میں اپنے محرم کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے چہ جائیکہ غیر محرم مردوں اور رشتے داروں کو۔ البتہ جن محرموں کے لیے اس نے صراحتاً" اجازت دے رکھی ہو یا اس پر وہ خاموش رہتا ہو تو ان کو عورت گھر کے اندر آنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

امام سے پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا تمہارا ایک آدمی ' جب اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے ' اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے یا اللہ اس کی صورت کو گدھے کی صورت میں بدل دے۔" (بخاری و مسلم)
فائدہ : اس میں امام سے پہل کرنے کی وعید بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کے سر یا شکل و صورت کو گدھے کے سر یا صورت میں بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لیے مقتدی کو ہر کام امام کے بعد کرنا چاہیے۔ امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جانا یا پہلے سر اٹھانا یا کوئی اور کام پہلے کرنا سخت گناہ اور نہایت خطرناک ہے۔

نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم)
فائدہ : انسان کے دائیں بائیں دو پہلو ہیں ہم نہیں کوکھ کہا جاتا ہے۔ نماز کی حالت میں ان پہلوؤں (کوکھوں) پر ہاتھ رکھنا تکبر کی علامت ہے جب کہ نماز تو سراسر بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز مندی کے اظہار کا نام ہے۔ تاہم پہلو میں درد ہو اور اس کی وجہ سے کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت پیش آجائے تو بات اور ہے۔ اس وقت ایسا کرنا جائز ہو گا۔

نماز سے پہلے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ اس وقت، جب کہ پیشاب، پاخانے کی شدید حاجت ہو۔" (مسلم)

فائدہ : یہاں نفی بمعنی نہی ہے، یعنی کھانے یا پیشاب پاخانے کی حاجت کے وقت کوئی شخص نماز نہ پڑھے لیکن یہ حکم ایسے شخص کے لیے ہے جس کو شدید بھوک لگی ہو اور کھانا بھی سامنے تیار ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ کھانے سے پہلے نماز پڑھے گا تو سکون اور خشوع و خضوع سے نماز نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح پیشاب پاخانے کی ضرورت بھی شدید ہو تو پہلے قضائے حاجت کا اہتمام کرے اور پھر نماز پڑھے۔

نماز میں آسمان کی طرف دیکھنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اپنی نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔" چنانچہ اس کی بابت آپ کا لہجہ سخت ہو گیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگ اس سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔" (بخاری)

فائدہ : نماز میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا خشوع و خضوع کے منافی ہے، اس لیے اس پر سخت وعید فرمائی گئی ہے۔ تاہم نماز کے علاوہ "مثلاً" دعا کے وقت یا غور و فکر کے وقت آسمان کی طرف نگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بغیر عذر کے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی بابت پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ ایک جھپٹ ہے جس کے ذریعے سے شیطان بندے کی نماز کا کچھ حصہ اچک لیتا ہے۔" (بخاری)

فائدہ : جھپٹ یا اچک، لینے کا مطلب ہوتا ہے، کسی کی غفلت اور بے خبری میں نہایت تیزی سے اس کی چیز لے لینا۔ جب انسان نماز میں خشوع و خضوع کے بجائے ادھر ادھر دیکھتا ہے تو یہ گویا انسان کی غفلت اور بے خبری ہے۔ جس سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی نماز کو بے اثر کر دیتا ہے۔

قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کا بیان

حضرت ابو مرثد کناز بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"قبروں کی طرف رخ کر کے نماز مت پڑھو اور نہ ان کے اوپر بیٹھو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : (1) قبروں کی طرح رخ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح مشرکین کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غیر اللہ کی تعظیم کا پہلو بھی اس سے نکلتا ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتا ہے۔

(2) قبروں پر بیٹھنے سے انسان کی تذلیل ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو توقیر و تکریم سے نوازا ہے۔ اس لیے ان دونوں کاموں سے بچنا چاہیے۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو جہیم عبداللہ بن حارث بن صمہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو یہ علم ہو جائے کہ اس کا کتنا گناہ ہے تو وہ گزرنے کے

بجائے چالیس تک کھڑے رہنے کو اپنے لیے بہتر سمجھے گا۔"

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے چالیس دن، چالیس مہینے یا چالیس سال فرمایا تھا۔(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا نہایت سخت گناہ ہے۔ نمازیوں کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ سترے یا ستون کے بغیر عام گزرگاہ پر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں، اس سے یا تو گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے یا مسئلے سے ناواقف لوگ آگے سے گزرتے رہتے ہیں۔

(2) اگر سترہ وغیرہ نہ ہو تو کتنے فاصلے سے نمازی کے آگے سے گزرنا جائز ہے، اس کا اندازہ تین میٹر یا تین صف کیا گیا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر چار پانچ صف کا اندازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ عالم۔

جمعے کے دن کو روزے کے لیے اور جمعے کی رات کو نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کرنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم جمعے کی رات کو دوسری راتوں کے درمیان سے قیام (نفلی نماز وغیرہ) کے لیے خاص نہ کرو اور جمعے کے دن کو دوسرے دنوں کے درمیان سے روزے کے لیے خاص نہ کرو، مگر یہ کہ جمعہ اس مدت میں آجائے جس میں تمہارا ایک آدمی روزے رکھتا ہو۔" (مسلم)

فائدہ : جیسے ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا کسی شخص کا معمول ہو، اس میں جمعے کا دن آجائے۔ یا عاشورے یا عرفے کا روزہ رکھتا ہو، اس میں جمعہ کا دن آجائے، یا ایام بیض کے روزوں میں جمعہ آجائے، یا اس نے نذر کے روزے شروع کر رکھے ہوں، ان میں جمعہ آجائے۔ ان تمام صورتوں میں جمعے کے دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صرف بطور خاص جمعے کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

جمعہ کے دن کا روزہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن روزہ نہ رکھے۔ ہاں، اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ ملا لے (تو پھر کوئی حرج نہیں۔)" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں جمعے کے دن روزہ رکھنے کی ایک اور صورت کا بیان ہے کہ جمعرات یا ہفتے کے دن کا روزہ ساتھ ملا لیا جائے تو ٹھیک ہے۔

ممانعت

حضرت محمد بن عباد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

"کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟"

انہوں نے فرمایا "ہاں۔" (بخاری و مسلم)

جمعہ کا روزہ

ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہ بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) جمعے والے دن ان کے پاس تشریف لائے جب کہ وہ روزے سے تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا۔

"کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا؟"

انہوں نے عرض کیا "نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا تمہارا ارادہ کل کا روزہ رکھنے کا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا "نہیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "روزہ افطار کر لو۔" (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے صرف جمعے کا روزہ رکھا ہو تو اسے توڑنا ضروری ہے۔

بغیر کھائے پیے دو دن یا زیادہ دن مسلسل روزہ رکھنا

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا

"آپ خود تو وصال کرتے ہیں (بغیر کھائے پیے مسلسل روزہ رکھتے ہیں؟)"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں تم جیسا نہیں ہوں، مجھے تو (اللہ کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) بعض شرعی معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصی احکام تھے جن کی رو سے، بعض چیزیں آپ پر واجب تھیں امت پر وہ واجب نہیں، آپ کے حق میں وہ جائز تھیں، امت کے لیے ان کا جواز نہیں ہے۔ ایسی چیزیں آپ کی خصوصیات کہلاتی ہیں جن میں امت کے لیے آپ کی اقتدا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ ان ہی خصوصیات میں سے ایک صوم وصال ہے جس کا مطلب ہے بغیر کھائے پیے مسلسل کئی کئی دن کا روزہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و تحمل کی جو خصوصی قوت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے آپ روزوں میں وصال فرمایا کرتے تھے۔ لیکن افراد امت میں وہ قوت نہیں کہ وہ اس کا تحمل کر سکیں، اس لیے ان کے لیے وہ جائز نہیں۔

(2) میں تم جیسا نہیں کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ نے مجھے جو خاص قوت عطا کی ہے، اس سے تم محروم ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مطلب انما انا بشر مثلکم نص قرآنی کے خلاف ہے۔

(3) کھلائے پلائے جانے سے، مراد بھی روحانی قوت ہی ہے نہ کہ روزے کی حالت میں کسی خصوصی غذا کا اہتمام کیونکہ کھانا پینا تو روزے ہی کے منافی ہے۔

قبر پر بیٹھنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کسی شخص کا انگارے پر بیٹھنا، جو اس کے کپڑوں کو جلا دے اور اس آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے، کسی قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔" (مسلم)

فائدہ : قبر پر بیٹھنے میں مردے کی اہانت کا پہلو ہے، اس لیے اس کو بھی سخت گناہ قرار دیا ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

قبر کو پختہ کرنے اور اس پر عمارت (قبہ وغیرہ) بنانے کی ممانعت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے، اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے۔ (مسلم)

فائدہ : قبروں کو پختہ کرنا ایک تو فضول خرچی ہے، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ مردے کو نہیں ہوتا۔ دوسرے، اس میں فوت شدگان کی ایسی تعظیم ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ قبروں پر قبہ اور گنبد وغیرہ بنانے کا بھی یہی معاملہ ہے اور قبروں پر بیٹھنا تکریم انسانیت کے منافی ہے۔ اس لیے ان تینوں کاموں سے روک دیا گیا ہے۔



مجموعہ محمد خالد اختر (سفر نامے)

مصنف: محمد خالد اختر
تبصرہ: آمنہ زریں

دنیا کیا ہے؟

خانہ بدوشی!

ہر اگلا مرحلہ۔ پچھلے مرحلے سے جدائی کا تقاضا کرتا ہے۔ بچپن، جوانی، رشتے، صحت، عروج۔ سب کچھ چھوڑتے چھوڑتے۔ ہنسی خوشی۔ دنیا چھوڑ دینے کی صلاحیت موجود ہو تو یہ مظہر ہے اس عنصر کا کہ طمع و حرص سے محفوظ ایک دل ہے۔ جو درویش کا ہے!

کیونکہ بس درویشی ہی وہ ہنر ہے جو آبلہ پائی کے ان تمام مرحلوں سے گزرنے کا آسان نسخہ ہے!

احساس، خیال کو پنہائیاں عطا کرنے والا عنصر ہے۔ اور اس کا منبع۔ سمندر کی وسعت اور گہرائی سے مماثل۔ دل کا مقام ہے۔ ایک شفاف دل کا عطا ہونا۔ حصول لطف کا بے مثل ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ ہر لحہ نیرنگئی خیال۔ بھی ایسی مہمیز ثابت ہوتی ہے کہ چار دن کی اس دنیا میں کہ جس کو بے ثبات کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سرشاری کے عالم میں۔ ایسی بھرپور زندگی گزار جاتے ہیں، جو نادر و کامیاب تو ہوتی ہے۔ قابل رشک و تقلید بھی ٹھہرتی ہے!

زیر نظر کتاب، صاحب کتاب کے ان اوصاف کو آپ سے متعارف کرواتی ہے اور کیا مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے کہ صاحب کتاب کو پیش کیا جائے یا کتاب کو، کس طرح دونوں کو مربوط کیا جائے؟

خیر۔ چلتے ان دلچسپ سفرناموں کے مجموعے کی جانب۔ جہاں آپ کے لطف اور خیال کو بھی پنکھ عطا ہوتے ہیں!

"اب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے۔ یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ کھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی۔ ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گزرے، جس کے حاشیے پر شان دار درخت ایک زمردیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے۔ ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے۔ مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً" پہلا منظر تھا، جس نے پہاڑوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اچانک باغ ارم کی طرح مہک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔"

"اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈیلو سے نوں کوٹ تک اونٹ پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رچنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہو گا۔ ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد، موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں۔ اور مسافر یوں محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفر نہیں۔"

"اگر کوئی حیوان مشین سے، کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ مطمئن، بے اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں۔ اسے غور سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا، تاہم یہ ایک ناقابل تصور مقدار نگل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر دیر بیٹھے رہنا اس

کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں۔) ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہنا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت، برداشت اور لاابالی پن نہیں جتنا اونٹ میں‘ اور اگر اسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!“

یہ ذکر ہے، 1945ء میں تھر کے گاؤں ڈھلو سے نوکوٹ تک کے اس سفر کا‘ جو اونٹ پر بیٹھ کر طے کیا گیا۔ صحرا کی چاندنی‘ رات کا حسن‘ ساربان کے نغمے‘ درختوں کے مہیب سائے میں ڈھلتی ہوئی تخیل کی وارداتیں۔ اور پھر صبح کے ظہور کا دل آویز بیان۔

جس کے لیے ”عناصر کی کروٹوں میں سے ایک ہی کروٹ مجھے سب سے زیادہ اور خوب صورت“ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔

مسافر کی عمر اس وقت 25 سال تھی!

دوسرا سفر جو انہوں نے ایک ایسے شخص سے ملاقات کی خاطر رکھا جو دور افتادہ علاقے میں محض اپنے محدود وسائل سے طلبا کی تعلیم کے لیے دن رات وقف کیے ہوئے تھا۔ یہ سفر‘ سائیکل پر طے ہوا۔ اور راستے میں چلنے والے تمام کردار‘ مناظر کا احوال کتنی آسانی اور روانی سے ہم تک پہنچتا ہے!

”یہ ایک وسیع رات تھی۔ محرم کی تیسری کا چاند ایک زریں درانتی کی طرح‘ تاریک مخملی آسمان میں معلق تھا۔ اس کی دھار کی زد میں ایک سفید چنچل ستارہ مسکرا رہا تھا۔ مولوی فقیر اللہ کا غریبانہ کوٹھا مسجد‘ ارد گرد طالب علموں کے حجرے‘ مدھم اور پر اسرار کھیتوں کی وسعت میں ایک نیلے جھٹپٹے کا لحاف اوڑھے خاموش پڑے تھے۔“

”یہ ریاستی دہقان عالم جس کا عربی فقہ اور حدیث کا مطالعہ وسیع تھا‘ جو مجسم طمانیت اور رضا تھا‘ جو فولاد کے مجسمے کی طرح ٹھوس اور دن کی طرح ایمان دار اور بے باک تھا۔ کھلی ہواؤں اور صالح خوراک کے بنے ہوئے مضبوط جثے والا یہ شخص‘ بردباری‘ تحمل‘ خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا یہ پتلا۔ رسول عربی کا مذہب صرف ایسا ہی شخص دنیا میں پھیلا سکتا تھا۔ اس نے مذہب کی سچی روح اپنے اندر تحلیل کرلی تھی اور اس کا دمکتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی روشنی کا پتا دیتا تھا۔ وہ ایک مذہبی جنونی نہ تھا۔ ان آدمیوں میں سے نہیں جو خدا کا چغہ پہن کر اپنے ہم نفسوں پر جج بن کر بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب متعین کردیتے ہیں۔“

ہر سفر ایک مہم نہیں ہوسکتا۔ اس کو مہم بنانے کے عناصر‘ دریافت اور حصول طلب کی سچی لگن ہیں۔ سو‘ ہر سفر کے اختتام پر فہم وادراک کے نئے مہمان جہان ہمراہ ہوتے ہیں!

”مذہب میں جو حقیقی طور پر خوفناک اور شیطانی عنصر ہے‘ وہ جنون کا ہے اور میری نظر میں ایک مذہبی دیوانے سے بڑھ کر قابل نفرت اور گھناؤنا شخص اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جنون آدمی کا سب سے ذلیل جبلی جذبہ ہے۔ یہ نفرت کی دیوی کو پیدا کرتا ہے۔ نفرت ہمیشہ تباہ کرتی ہے اور نفرت پر جو کچھ پلتا ہے‘ زندہ رہنے والا نہیں ہوتا۔“

یاد رہے کہ یہ نظریہ ہر مذہب کے حوالے سے مربوط ہے!

”ہمارے گائیڈ نے جو ایک نورانی وجود کے ہلکے قدموں سے چلتا جاتا تھا‘ ہماری ڈھارس بندھائی کہ جھیل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے یقین دلانے کے باوجود یہ پہاڑ نہ ختم ہونے والا ثابت ہوا۔ راستہ اس کے اردگرد ایک سانپ کی طرح سکڑتا‘ لپٹتا چلا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ راستہ آدمی کے پاؤں کے سہارے سے بھی باغی ہوجاتا اور وہاں سے گزرنے کے لیے چٹانوں کی نوکوں اور کنکروں کو پکڑنا پڑتا۔ ایک خاص نم دار جگہ کا تصور کرکے مجھے اب بھی پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں راستہ یک لخت ختم ہوجاتا تھا اور تین چار فٹ خلا کے بعد یہ پھر شروع ہوجاتا تھا۔ خلا نیچے چٹانی کھائیوں سے کوئی پانچ سو فٹ بلندی پر ہوگا۔ پاؤں کی

ذرا سی چُوک سے آدمی گر کر نیچے چٹانوں پر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ ہم سب کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے، مگر آخر الامر ہم ایک ایک کر کے چٹان کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے دوسری طرف پہنچ گئے۔"

اپنے گہرے اور شفاف اور اُفق پر ابھرنے والے ہر عکس کو پڑھنے والے کے ذہن پر مرتسم کرنے کی صلاحیت جزئیات نگاری کہلاتی ہے اور ارد گرد موجود تمام عناصر کا مشاہدہ، قاری کو مربوط تسلسل سے جوڑے رکھنا ہے!

"اس پیچ دار راستے پر چلتے ہوئے ہم پہاڑ کے ایک کونے پر آئے اور یہاں اچانک ہماری نظریں فطرت کے ایک بے مثال نظارے پر پڑیں اور ایک لمحے کے لیے ہمارے سانس رک گئے۔ ہم دم بخود ہو کر اس معجزے کو دیکھنے لگے۔

نیچے جنگلوں سے ڈھانپے ہوئے چٹانی نشیبوں اور بلندیوں کے درمیان ایک زریں دھند کے میدان میں سیف الملوک جھیل یاقوت ____ کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ سفید برف کے تودے اس کی صاف سطح پر تیر رہے تھے۔ ان میں سے چند اپنے خاص زاویے کی وجہ سے سورج کی روشنی میں خون سا چھلکا رہے تھے۔ جھیل کے مشرقی کونے سے کچھ دور ایک پُرشکوہ برف سے سفید پہاڑ اپنا مغرور سر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ تراشا ہوا بلور تھا۔ اور اسی لیے وہ اسے شیشہ پہاڑی کہتے ہیں۔ اس آسمانی منظر کو دیکھ کر ہماری سب تھکاوٹ، گویا جادو کے اثر سے اتر گئی۔

یہ کاغانی مہم تھی جو 53ء میں سر کی گئی اور ہر مہم اپنے آغاز سے انجام تک کے ہر مرحلے، ہر پڑاؤ، ہر دریافت، ہر کردار، ہر منظر کی مجسم تصویر ہے۔ وہ سفری صعوبتیں ہوں یا سہولتوں کی عدم دستیابی، شہروں کے نام ہوں یا کھیت کھلیان۔ خانہ بدوش قافلے، مویشی اور ان کے چرواہے، چمکتی ہوئی چاندی یا ڈوبتے ابھرتے سورج کے رنگوں کا بیان۔ ہم ان مناظر کو نئی حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں!

"کئی قسموں اور قوموں کے، مچھروں اور پسوؤں نے میرے بستر کو ایک تڑپا دینے والا دوزخ بنا دیا، لیکن وہاں کا ایک بدترین عذاب مکھیاں تھیں۔ مکھیاں وہاں ایسے اونچے مقام پر اور سرد موسم میں کیوں تھیں، یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال، وہ وہاں موجود تھیں اور جھنڈوں میں بھنبھناتی ہوئی یلغار کرتی ہوئی نتھنوں اور کانوں میں گھسی پڑتی تھیں، کمبل کے نیچے آکر قمیص کے گلے یا آستین میں سے، انسانی جلد تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈتی تھیں، ایک گھنٹے تک یہ سزا بھگتنے کے بعد میں نے سونے کی خواہش کو خیرباد کہہ دیا اور پائپ سلگا کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔"

"ہم ایک سیلون میں جا گھسے۔ یہ ایک بے انتہا غلیظ اور تاریک جگہ تھی۔ حجام صورت سے ایک قاتل معلوم ہوتا تھا، مگر ایک بار اندر جا کر پلٹنا ناممکن تھا۔ میں نے ایک بالکل کند استرے سے حجامت کرائی۔"

جانیے سفر کے بارے میں ان کی رائے۔

"اگر ایک شخص میں خانہ بدوشی اور سفر کا اصل جذبہ نہیں، اگر وہ چیزوں اور اپنے ہم جنسوں کو ایک شاعر کی روح سے دیکھنے سے قاصر، تو ایسے آدمی کے لیے بہتر ہے کہ وہ سفر نہ کرے۔ ایسے آدمی کے لیے سفر میں نفع نہیں۔"

"اپنے سفر کے اختتام پر ہم نہ صرف جسمانی طور پر زیادہ صحت مند تھے بلکہ ہر طریق سے پہلے سے زیادہ سیانے اور زیادہ بہتر آدمی تھے۔ سواتی مہم نے ہماری رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کو نیا کر دیا تھا، ہمارے دماغ پر جمے ہوئے میل کو دھو ڈالا تھا اور اسے خوب صورت یادوں کا خزانہ دے کر بے اندازہ امیر کر دیا تھا۔"

چلیے ریل کے سفر پر

"یہ مسافر گاڑی شاید دنیا بھر کی گاڑیوں میں سب سے آہستہ رفتار تھی۔ یہ زریں سہ پہر میں چمک چمکاتی اس کاہلی اور آلکسی سے چل رہی تھی، جیسے اسے کسی خاص منزل پر نہ جانا ہو، بلکہ بس، یونہی مٹر

گشت کرنے نکلی ہو۔ مگر اسے ملکوال تک ہی تو جانا تھا' جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"ترائی ایک مستقل دلچسپیوں کی تصویروں کا البم تھی۔ ابھی تمہارے سامنے ایک اونچی گھاس اور سبزے کی چراگاہ ہوتی' دوسرے لمحے ایک سیاہ آب و گیاہ چٹیل میدان تمہارے سامنے آجاتا اور اس کی ویرانی تمہارے خون کو برف کردیتی۔"

قاری کو مخاطب کرنے والی تحریر میں انسیت کا اولین احساس دھیرے دھیرے پختہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے اور پڑھنے والا خود کو ہر لمحے میں صاحب تحریر کے ساتھ محسوس کرنے کا لطف اٹھاتا ہے۔

"اے میرے قاری! یقیناً کسی دن تم اور میں اسی طرح اکٹھے اس سڑک پر سانا کونڈی جائیں گے' کیونکہ ایک ایسے نام والی جگہ کو دیکھے بغیر آدمی زندہ ہی کیسے رہ سکتا ہے!"

منو۔ کتابوں سے وارفتگی ... کر عالم کی ایک کیفیت "مجھے کتابوں سے محبت ہے۔ پرانی' قدیم مڑے ہوئے کونوں والے ورقوں' انگوٹھوں سے میلے صفحوں والی کتابوں سے خصوصی دنیا میں کوئی خوشبو مجھے اس خوشبو سے زیادہ پسند نہیں جو بوسیدہ نسخوں' ان کی قدیم جلدوں اور زرد پائے ہوئے اوراق سے آتی ہے۔"

خالد صاحب کے ذوق مطالعہ نے ان کے تخیل پر ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات مرتب کیے۔ انگریزی' اردو دونوں میدانوں کی شناوری نے ان کے اسلوب بیان پر ایک منفرد لہجہ عطا کیا' جو فطری روانی کے جمال اور اثر آفرینی سے بھرپور ہے۔ دوران سفر اپنے شناسا کرداروں سے تشبیہات آپ پر ان کے ذوق مطالعہ کا راز کھولتی ہیں۔

کتاب کے تعارفی الفاظ' قاری کو پیش آنے والے ذہنی ارتقاء کے مرحلے کے لیے جلا بخش رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور اپنے ہنر کی مشاقی کے مظہر بھی۔

"زیر نظر جلد میں شامل آخری تین سفرناموں کو چھوڑ کر باقی تمام سفر اندرون ملک مقامات کے ہیں' جس سے محمد خالد اختر کے رویے کا بنیادی عنصر ظاہر ہوتا ہے جس کی رو سے اصل اہمیت اس مقام کی نہیں ہے' جس کا سفر اختیار کیا گیا ہے بلکہ سفر کے ازلی انسانی تجربے کی ہے۔"

"پڑھنے والے کو مسحور کرنے والی بات ان انسانی کرداروں کی رنگا رنگی ہے' جو اپنی مخصوص صورت حال سے دوچار انسانوں پر مشتمل زندگی کا میلہ ہی ہے جس سے محمد خالد اختر کا سفری تجربہ عبارت ہے۔"

چلیے دیکھتے ہیں اپنے کچھ شہر۔ جو ہمارے ہیں' لیکن ہمارے پاس ان کو دیکھنے کی فرصت اس طرح سے نہیں!

"ہم اب لاہور کے نزدیک تھے۔ اندھیری مخملی رات میں پیلی' نیلی اور سرخ روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ ہمارے دلوں نے وہ لذیذ دھڑکن محسوس کی جو لاہور میں وارد ہونے والے ہر سچے مسافر کو محسوس ہوتی ہے۔ تم خواہ پہلی بار لاہور کے نزدیک آؤ' خواہ تیسویں بار' یہ عجیب روح کی اٹھان' یہ پُر اشتیاق دھڑکن تمہیں ضرور محسوس ہوگی۔ لاہور ایک ایسی کافر محبوبہ ہے' لاتعداد دلربائیوں اور عشوہ طرازیوں کی حامل' کہ اس کے چاہنے والے اس کے لیے ہمیشہ تڑپتے رہتے ہیں۔

ہم راوی پر سے گزر کر شیخوپورہ جانے والی سڑک پر مڑے تو سورج نکل آیا۔ ہمارے گرد کی وسیع کھیتوں اور سبزے کی دنیا دمک اٹھی۔ ہمارے دل گانے لگے۔ ہوا میں بہار کا سانس تھا۔ فصلیں کٹ چکی تھیں اور کٹے ہوئے کھیت پیلے سونے کے سے تھے۔"

"خوشاب ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ یہاں تم گویا ہیبت کی عنابی پہاڑیوں کے سائے میں آجاتے ہو اور اچانک ان کی موجودگی سے آگاہ ہوجاتے ہو۔ ہمارا احمد ندیم قاسمی بھی تو ان ہی پہاڑوں کا رہنے والا ہے۔ ابھی کیورس نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ نمک کا پہاڑ ہے۔ یہ نمک کا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تو گلاب اور عنبر

کے رنگ کا ہے۔ یہ ایک مستقل طور پر جھانکتا ہوا پہاڑ ہے اور خوشاب کے بازاروں اور کوچوں کو ایک زندہ شفیق دوست کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔"

دیکھیے ایک جگہ رکنے کا منظر۔

"ہم نے چائے کی ایک چھوٹی دکان میں میٹھی چائے اور مکھن لگے بری بنوں کا ناشتا کیا۔ ان چھوٹی چائے کی دکانوں میں جو ساری رات کھلی رہتی ہیں، مجھے بڑا رومانٹک ماحول نظر آتا ہے۔ ان کی کھردری لمبی میزیں، ٹین کی کرسیاں، نیلی پام چینی کی چائے دانیاں۔ میں ان سب سے محبت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی جو وہاں آتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک رفاقت کی خوشبو ہوتی ہے اور تم وہاں زندگی کی گھماگھمی کا مزا دیکھتے ہو۔"

مسکراتے بغیر مزاح پیدا کرنا فطری خوش طبعی کی بدولت ہے اور صورت حال کے مطابق فطری ہیت کذائی سے مزاح کا عنصر ڈھونڈ لینا قدرتی رفاقت کا مظہر۔

"رش کی حالت دیکھ کر ہمارا جی بیٹھ گیا مگر قلیوں نے ہماری ہمت بندھائی۔ انہوں نے پہلے تو جوں توں کر کے بند دروازے کی کھڑکی سے ہمارا سامان اندر پھینکا اور پھر سامان کے بعد ہماری باری آگئی اور قلیوں نے ہمیں باری باری اٹھا کر دروازے سے اندر گھسیٹر دیا۔ کافی عرصے تک ہمیں پتا نہ لگ سکا کہ ہم کون سے ہیں اور ہمارا اسباب کون سا۔ آدمی آدمی پر چڑھا بیٹھا تھا۔ بعض لوگ دوسرے لوگوں کی گود میں بیٹھے تھے۔ بعض اسباب کے اوپر لٹکے ہوئے تھے اور میں نے کم از کم ایک ایسا مسافر بھی دیکھا جس کے اوپر اسباب بیٹھا ہوا تھا۔"

"ترائی کے میدانوں اور پہلی پہاڑیوں پر رات پڑ گئی تھی۔ کھیوڑہ دور پیلی پیلی روشنیوں کا انبوہ تھا۔ آٹھ بجے گاڑی ملکوال جنکشن میں داخل ہو گئی۔"

وادیِ سوات کا محل دیکھیے۔

"ہمارے سامنے زمردیں گھاس کے قطعے کے حاشیے پر سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک چھوٹا سفید محل ایستادہ تھا۔ اس ننھے محل میں پھول کی ایک پتی کی سی نزاکت تھی۔ ایک غیر مرئی صفت۔ یہ پریوں کا محل تھا۔ پریاں اس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں اور محل سونا تھا۔"

آخری تین سفرنامے ترکی، یونان اور قونیہ کی مہمات کی داستانیں ہیں، جو انہوں نے 72 سال کی عمر میں اسی ولولے اور گرم جوشی سے طے کیں۔ جو صرف ایک خالص مہم جو کا خاصا ہوتی ہیں!

"دونوں کے پیچھے یہ تہتر برس کا نوجوان، نیم جاں بوڑھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے آپ کو پینتیس برس کا جوان سمجھتا۔"

تیز رفتاری سے بدلتی اردگرد کی دنیا میں، ترکی سے اب پاکستانی تھوڑا بہت مانوس ہیں۔ لیکن یہ روداد 91ء کے سفر کی ہے اور اپنے آپ میں ترکی کی دلکش داستان ہے!

ترکی کا سفرنامہ انہوں نے مکتوب غالب کے انداز میں لکھا ہے جو زبان و بیان کا خوب صورت نمونہ ہے۔

"ہاں صاحب، تمہارے استنبول کو تین مسافروں نے خوب چھانا پھٹکا حق سیاحت ادا کیا کہ مارکو پولو بھی سنے تو خجل ہو نادم ہو۔"

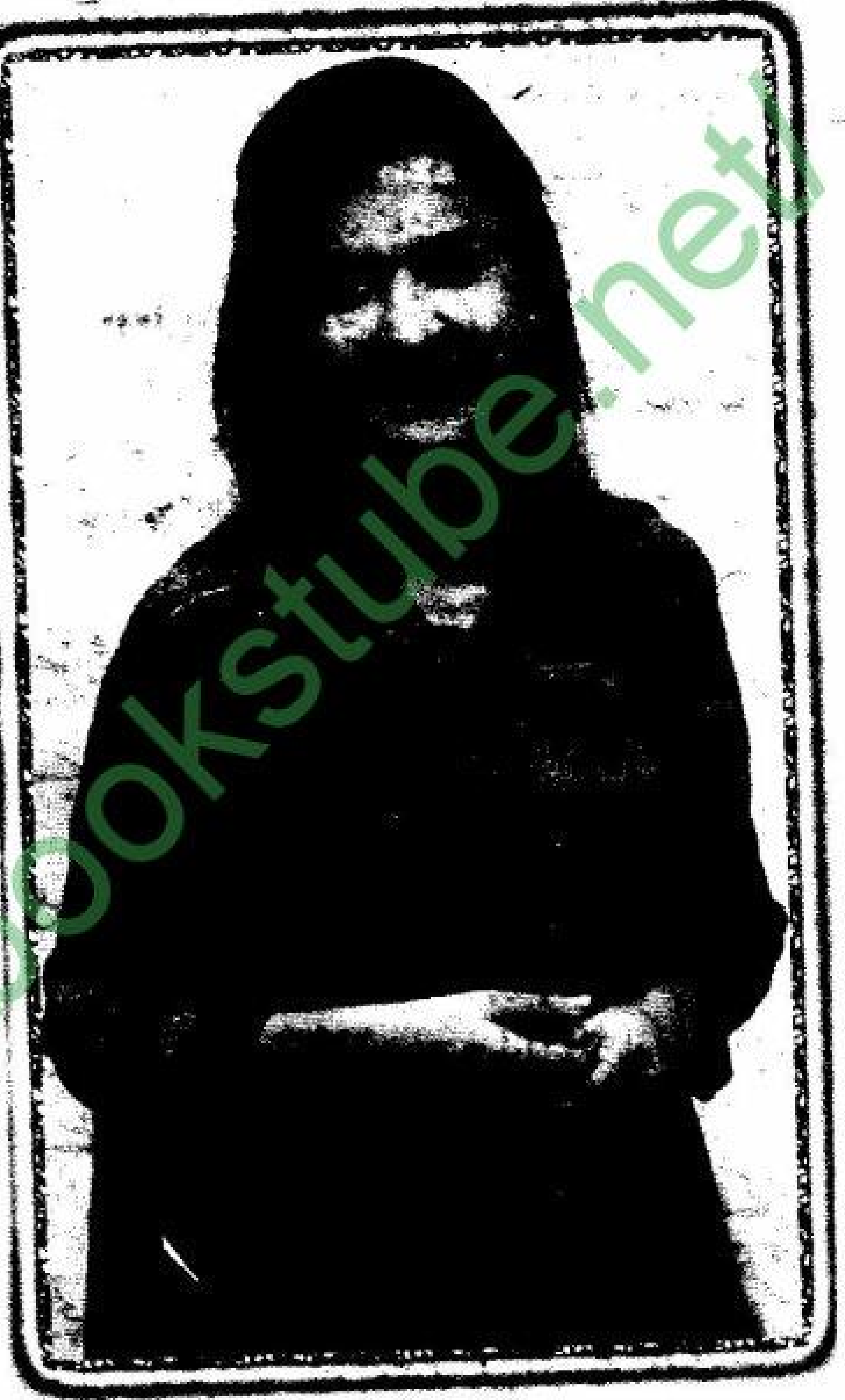
بس، ٹرین، جہاز، فیری پکڑنے اور چھوٹنے کے دلچسپ قصے، یونانی جزیروں کے خوب صورت مناظر، جہاز کے عرشے سے سمندر میں ڈوبتے سورج کے رنگ، رہائش اور سیاحت کے لطف، انگیز بیان آپ کے تخیل کو اڑتا ہوا قالین بنا دیتے ہیں۔

درویش کی ایک خوبی دینے کی صفت ہوتی ہے۔ اس کے پاس جو موجود ہو وہ اسے دینے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ اس درویش کے پاس دینے کے لیے اپنے ذہنی، قلبی و روحانی تجربات کا جوہر اور لطف تھا سو اس نے کمال فیاضی سے دیا۔ ایک سچے مہم جو کی رفاقت کا لطف، اس کے لطف اٹھانے کی صلاحیت سے لطف اٹھانے کا لطف۔ اگر آپ بھی جستجو رکھتے ہیں تو ایک شاندار سفر آپ کا منتظر ہے! ✡

ڈرامہ سیریل آپ کی کنیز کی کنیز

یمنیٰ زیدی سے ملاقات

شاہین رشید



یمنیٰ زیدی ناظرین کے لیے اب نیا نام نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بہترین پرفارمنس سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ آپ کی کنیز میں اس کا بہترین کردار ہے ایک ڈری سہمی گاؤں کی لڑکی ایک بڑے گھر میں بیاہی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کی بہترین ترجمانی اس فنکارہ نے کی ہے۔ آج کل کیا آن ایر ہے کیا کچھ آنے والا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے یہ جاننے کے لیے یمنیٰ سے ایک گفتگو۔

"ہیلو کیسی ہو... ماشاء اللہ بہت اچھی پرفارم ہو؟"

"جی اللہ کا شکر ہے بہت شکریہ پسند کرنے کا۔"

"کیا مصروفیات ہیں... کیا آن ایر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"ماشاء اللہ سے مصروفیات بہت زیادہ ہیں آپ کی دعاؤں سے۔ آج کل "جیو" سے "آپ کی کنیز" آن ایر ہے اور پی ٹی وی سے "کس سے کہوں" جبکہ آنے والے سیریلز میں "جگنو" فاروق رند کی ڈائریکشن ہے۔ بہت ہی ہلکا پھلکا لائٹ کامیڈی کردار ہے میرا۔ "پارس" کے نام سے جیو سے ہوگا اسے عامر یوسف نے ڈائریکٹ کیا ہے اے اینڈ بی کی پروڈکشن ہے اور جگنو کے بارے میں مزید بتاؤں کہ اسے "آمنہ مفتی" نے لکھا ہے۔"

"اپنے لیے کردار کا انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان... اور 2014ء آپ کا کیسا گزرا؟"

"جو آپ نے پوچھا کہ انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان تو میں سمجھتی ہوں کہ کردار کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ کون سا بہتر ہے اور کون سا نہیں... اور 2014 تو بہت ہی اچھا گزرا کام کے حوالے سے بھی اور ویسے بھی اور آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ مجھے "انیس بزمی" جو کہ بالی ووڈ کی پروڈکشن کمپنی ہے انہوں نے ایک فیچر فلم کے لیے مجھ سے رابطہ کیا اور لیڈ رول کی پیشکش کی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر بہت ہی آؤٹ اسٹینڈنگ کام ہو تو آپ کریں ورنہ نہ کریں۔

دوسرے ملک میں جا کر عام سے کردار کرنے کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی انڈیا سے فلم کی آفر آنا ہی میرے لیے بہت اچھی بات تھی اور خوشی اس بات کی ہوئی کہ ہمارا کام دوسرے ملکوں میں بھی دیکھا جا رہا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔"

"بالکل... آنے والے سیریلز میں کردار کس قسم کے ہیں پوزیٹو یا نیگیٹو۔ آپ کے زیادہ تر کردار تو پوزیٹو ہی ہوتے ہیں۔ اور کس قسم کے رول پسند ہیں؟"

"میں نے پوزیٹو اور نیگیٹو دونوں ہی طرح کے کردار کیے ہیں۔ رشتے کچھ ادھورے سے میں میرا تھوڑا نیگیٹو رول تھا۔ اور آنے والے سیریلز میں سب میں پوزیٹو رول ہیں یا پھر لائیٹ کامیڈی رول ہیں... میں چاہتی ہوں کہ بہت ہی اسٹرونگ قسم کے کردار کروں جن میں صداقت ہو اور لوگوں کو پتا چلے کہ ہماری پاکستانی لڑکی کتنی اسٹرونگ ہوتی ہے، مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے اور اپنے گھر کے لیے کتنی قربانیاں دیتی ہے۔ بس جس میں پرفارمنس ہو وہ کرنا چاہوں گی۔"

"آپ کی کنیز میں ایک سین میں آپ کو کتوں کے آگے ڈالا جاتا ہے۔ اور ڈرایا جاتا ہے۔ یہ کتنا حقیقی تھا؟"

"اس ڈرامے میں کتوں والا سین انتہائی خوفناک تھا۔ اور وہ سین کئی دنوں سے ملتوی ہو رہا تھا کیونکہ ڈائریکٹر کو بھیانک قسم کے کتے نہیں مل رہے تھے۔ اور جب ملے اور مجھے دکھائے گئے تو میں نے تو سین کروانے سے منع کر دیا۔ اور بہت مشکل سے ڈائریکٹر نے مجھے کنوینس کیا۔ کیونکہ ایسے خوفناک کتوں کے آگے کھڑے ہونا ہی بہت ہمت کی بات ہے اور اگر آپ چیخیں گے تو وہ تو آپ کی طرف لپکیں گے ہی نا... اور میں جب کتوں کے سامنے جاتی تو بھاگ کر واپس آ جاتی دو تین بار ایسا ہوا۔ تو مجھے خود احساس ہوا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر ڈائریکٹر نے بھی کہا کہ آپ سیریس ہو جائیں... میں نے دیکھا کہ جو کتوں کی رسی کو پکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بھی ہاتھ تھک گئے تھے...



بہرحال سین کروانے سے پہلے میں سچ مچ بہت روئی، بے شک مجھے ایکٹنگ کا شوق ہے۔ مگر یہ کام تو انتہائی مشکل تھا اور یہ سوچ کر بہت خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو... خیر میں نے بہت سی دعائیں مانگیں اور اپنے آپ کو اس سین کے لیے تیار کیا اور بڑی بہادری سے وہ سین کروایا اور پھر ڈائریکٹر سے کہا کہ آپ دیکھ لیں کہ میں نے کیسا کیا، اگر ٹھیک نہ لگے تو میں دوبارہ کروانے کے لیے تیار ہوں، پتا نہیں اتنی ہمت مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ لیکن میں سچ بتاؤں... اس سیریل میں میں نے بہت محنت کی ہے۔ یوں سمجھیے کہ میں نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ گاؤں کے سین، برائیڈل ڈریس میں بھاگنا کھیتوں میں رسی بندھی ہوئی... مگر جب سیریل آن ایئر آتا ہے اور لوگ اندرون ملک اور بیرون ملک پسند کرتے ہیں۔ ہماری تعریف کرتے ہیں، جب کینیڈا، آسٹریلیا، پیرس، امریکہ، برطانیہ سے آپ کے لیے فون آتے ہیں تو یقین کریں کہ محنت کا صلہ وصول ہو جاتا ہے اور ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے۔"

"واقعی۔۔۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ کی اداکاری میں دن بہ دن نکھار آتا جارہا ہے۔۔۔ اس فیلڈ میں آنے کا خیال کیسے آیا؟"

"بس اتفاق ہے۔۔۔ ہوا یہ کہ میری بہن این سی اے میں پڑھتی تھیں۔ اور کالج میں میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ تو بڑی بہن کے ایک کولیگ نے بتایا کہ لاہور میں ایک ڈرامہ بن رہا ہے اور اس کے ڈائریکٹر کو نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ تو میں نے ایسے ہی شوق شوق میں تھوڑا کام کرلیا۔۔۔ تو جب انہوں نے دوبارہ اپنے نئے سیریل کا آغاز کیا تو پھر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔۔۔ اور میں نے ہاں کردی۔ وہ ڈرامہ سیریل "تھکن" تھا اور اس میں میرا کردار اچھا خاصا اسٹرانگ تھا' جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس کردار میں میری پرفارمنس دیکھ کر کراچی کے معروف ڈائریکٹر محسن مرزا نے مجھے کال کی اور ڈرامہ سیریل "خوشی ایک روگ" کے لیے مجھے لیڈ رول آفر کیا۔ اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہ سیریل کتنا ہٹ گیا تھا اور آپ نے بھی اس سیریل کو دیکھ کر مجھے فون کیا تھا۔"

"بالکل مجھے یاد ہے۔۔۔ اور آپ کا سیریل تھکن بھی یاد ہے' جس میں آپ کا نیگٹو رول تھا۔ اس کے بعد نیگٹو رول کی ہی پیشکش ہوئی ہوگی؟"

"میرا لک کہ ایسا نہیں ہوا؟ جبکہ میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ اب مجھے ایسے ہی رول ملیں گے' مگر مجھے "خوشی ایک روگ" میں بہت ہی معصوم اور دکھی لڑکی کا رول ملا۔۔۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس سیریل نے بلکہ میرے اس رول نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی اور پھر تو آفرز نہ ختم ہونے کا ایک سلسلہ چل پڑا اور الحمد للہ کہ آج میں اس فیلڈ میں کافی کامیاب جارہی ہوں۔"

"ماشاء اللہ۔۔۔ تعریف نے مغرور کیا؟۔۔۔ اور کسی نے تنقید بھی کی؟"

"اللہ نہ کرے کہ میں کبھی مغرور ہوں' میں تو اپنے رب کا ہر دم شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔۔۔ اور ایسا نہیں ہے کہ لوگ صرف تعریف ہی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے' اور یہ تو ہمارے کام کا حصہ ہے۔ ہر کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا اور کوئی ہمیں بتائے گا تو ہم پرفیکٹ ہوں گے۔ خود سے تو نہیں ہو سکتے نا۔۔۔ تنقید سے تو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔"

"شہرت' دولت' عزت' کیسی لگتی ہے یہ دنیا؟ برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟"

"سچ پوچھیں تو مجھے تو اس میں زیادہ اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے کوئی بہت لمبا چوڑا زمانہ نہیں ہوا۔ مگر آپ دیکھیں کہ کم عرصے میں میں نے کافی اچھے سیریلز کیے ہیں اور کافی اچھے سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں۔"

"کامیابی کا کیا گر ہے؟"

"بس یہی کہ اپنی حدود' اپنی روایات' بڑوں کا عزت و احترام کرتے رہیں۔ سب آپ کے نزدیک آئیں گے۔ اصل میں اچھی تعلیم و تربیت بھی اس فیلڈ میں بہت کاؤنٹ کرتی ہے۔ آپ کا کردار آپ کا بی ہیویر اچھا ہونا چاہیے' برائی اور اچھائی کی طرف انسان دوسروں کو خود راغب کرتا ہے۔ اتنے مضبوط کردار کے ہو جائیے کہ کوئی آپ کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔ بس پھر آپ کامیاب ہیں۔"

"یمنیٰ! آپ نے کہا کہ اداکاری ایک مشکل کام ہے تو کبھی اس فیلڈ میں آکر پچھتاوا ہوا؟"

"ارے نہیں' بالکل بھی نہیں۔۔۔ سیدھی سادی اداکاری تو سب ہی کرلیتے ہیں' مگر مزہ تو مشکل کام میں ہے۔۔۔ بس مجھے "آپ کی کنیز" میں کتوں والے سین میں مشکل ہوئی تھی' مگر جب میں نے سوچا کہ کتوں کو تو پکڑا ہوا ہے اور مجھے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تو میں نے پھر با آسانی اس سین کو کرلیا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈرامہ سیریل "تھکن" میں مجھے سچ مچ مار پڑتی تھی مگر میں نہیں گھبراتی تھی۔ "خوشی ایک روگ" اور "میری دلاری" میں رونے کے سین حقیقی ہوتے تھے۔ میں سچ مچ روتی تھی۔ میں تو ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کرکے کرتی ہوں



تاکہ حقیقت کا رنگ آئے۔"

"اصل زندگی میں اس کا اثر ہوتا ہے؟"

"بہت ہوتا ہے۔۔۔ گھر والے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ چڑچڑے رول کر کے مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔۔۔ امی کہتی ہیں کہ ایسے رول مت لیا کرو گھر میں بھی ایسی ہی رہتی ہو۔۔۔ اب تھوڑے لائٹ کامیڈی رول کروں گی تو اس کا بھی مزاج پر اثر پڑے گا 'پھر میرے خیال سے گھر والے خوش ہو جائیں گے۔"

"فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں۔۔۔ اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"جی ضرور۔ میرا نام یمنیٰ زیدی ہے۔ جس کا مطلب لکی (Lucky) اور بلیس (Bless) ہے اور میرے نام کا اثر میری شخصیت پر بھی ہے اور واقعی میں ہر لحاظ سے لکی ہوں۔ شکر الحمد للہ۔ میں 3 جولائی 1989ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں جبکہ والد زمیندار ہیں اور چونکہ وہ اپنا زیادہ وقت زمینوں پہ گزارتے تھے تو امی نے ہماری تربیت کی۔ ہمارے گاؤں کا نام "عارف والا" ہے اور پڑھائی کے لیے ہم سب لاہور میں شفٹ ہوئے۔۔۔ ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہے اور میرا نمبر تیسرا ہے۔"

"بہن اور بھائی بھی ہیں اس فیلڈ میں؟"

"نہیں جی۔۔۔ کسی کو شوق ہی نہیں ہے' حالانکہ میری بہنیں بہت پیاری ہیں۔ بڑی بہن کو تو آفرز بھی آ چکی ہیں مگر ان کا رجحان ہی نہیں ہے اس طرف۔ اور ہاں یہ بھی بتا دوں کہ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ مگر ہماری تعلیم و تربیت پنجاب میں ہوئی اس لیے لک بھی ویسا ہی آ گیا۔"

"تعلیم مکمل ہو گئی تمہاری؟"

"جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا ماسٹرز مکمل ہو چکا ہے اور اس سال میری کانووکیشن ہے اور انٹیریر ڈیزائننگ میں میں نے ماسٹرز کیا ہے اور مجھے پڑھائی سے بہت لگاؤ ہے۔ میں نے اپنی مصروفیات کو اپنی پڑھائی پہ حاوی نہیں ہونے دیا۔"

"شادی نہیں کرنی کیا؟"

"بالکل کرنی ہے اور امی کی تو بس یہی خواہش ہے کہ یمنیٰ کی شادی جلدی سے ہو جائے۔ کوئی اچھا سا لڑکا یمنیٰ کو پسند آ جائے۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ میری زندگی اچھی گزرتی رہی اور اللہ ہمیشہ میرے حق میں بہتر کرے۔ اور میں یہ بات بڑے فخر سے کہوں گی کہ میں نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کیا۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ سے ہی بہت مہربان ہے۔"

"مزاج کیسی رہیں؟"

"ملا جلا رجحان ہے۔ غصہ بھی آتا ہے اور ہنس مکھ بھی ہوں۔ غصے کا اظہار بول کر کرتی ہوں اور جہاں نہیں بول سکتی 'اپنے آپ کو بے بس سمجھتی ہوں' وہاں مجھے پھر رونا آ جاتا ہے۔"

"غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟"

"مخصوص نہیں ہے کہ یہ بات ہو گی تو غصہ آئے گا۔ یہ نیچرل عمل ہے۔ کوئی بھی بات دل کو لگ جائے تو دکھ بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ اور ایک بات پر تو ہمیشہ غصہ آتا ہے 'جب میں دیے ہوئے ٹائم پر پہنچ جاتی ہوں تو پھر کوئی دوسرا ٹائم پر کیوں نہیں

آتا۔ بس ایک خامی ہے مجھ میں کہ میں اپنے کام میں بہت زیادہ پنکچوئل ہوں۔"

"شہرت نے کبھی پریشان کیا؟"

"شہرت اور پریشانی؟... بالکل بھی نہیں... شکر ہے کہ میری پہچان ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ پہچان تو برے کاموں سے بھی ہوتی ہے۔ جب لوگ ہمیں پہچان کر ہمارے پاس آتے ہیں تو آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے اور میں اپنے رب کا کتنا شکر ادا کرتی ہوں۔"

"فارغ وقت ملتا ہے تو کیا کرتی ہیں؟"

"اب تو فارغ وقت بہت ہی کم ملتا ہے... مگر آپ یہ سن کر یقیناً حیران ہوں گی کہ مجھے ڈرائنگ کا بھی شوق ہے اور میں شاعری بھی کرتی ہوں۔ مگر میری شاعری میری ڈائری اور مجھ تک ہی ہوتی ہے۔ ڈرتی ہوں کہ پتا نہیں کسی کو پسند آئے گی یا نہیں۔ کہانیاں لکھنے کا بھی شوق ہے۔"

"تو اصلاح کروالیا کرو... اور اپنے سارے شوق اداکاری کی نذر نہ کردینا؟"

"اصلاح... وہ تو امی کردیتی ہیں۔ کیونکہ میری امی "شبانہ زیدی" خود بہت اچھی شاعرہ ہیں... اور ایسا نہیں ہوگا کہ سب کچھ اداکاری کی نظر ہوجائے۔"

"اور گھرداری؟"

"میں ہوم اکنامکس کالج کی تعلیم یافتہ ہوں۔ اندازہ لگائیں کہ گھرداری میں کیسی ہوں گی۔ مجھے بہت شوق ہے گھرداری کا... گھر کو صاف ستھرا رکھنا اچھا پکانا اچھا کھانا... سب کچھ آتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکی کو سب کچھ آنا چاہیے اور..."

"تاکہ پرائے گھر جاکر مشکل نہ ہو؟"

قہقہہ... "امی بھی یہی کہتی ہیں... اور ٹھیک کہتی ہیں وہ بھی تو ایک طرح سے جاب ہوتی ہے اور بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

"گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟"

"سب سے... میں جب اس فیلڈ میں آئی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے والد جو کہ غصے کے کافی تیز ہیں' ناراض ہوں گے' مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بھی مجھے بہت سپورٹ کیا۔ اور بچوں کو کسی معاملے میں سپورٹ کرنا ماں باپ کے پیار کا اظہار ہوتا ہے۔ اور میری دادی جان جن کا انتقال ہوچکا ہے۔ میرے کام کو بہت پسند کرتی تھیں اور بہت تعریف کرتی تھیں... اور ہاں مزے کی بات بتاؤں کہ صرف میری نانی اس بات کے خلاف تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں... یہ بھی ان کا پیار ہی تھا۔ خیر سچ میں مجھے اپنے گھر والوں سے بہت پیار ملا اور مل رہا ہے۔"

"اور جناب کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہونے والا ہے فروری میں... لگاؤ ہے کرکٹ سے؟"

"بالکل ہے جی... اور جب اپنے میچ ہوں تو دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مگر جب ہم ہارتے ہیں تو پھر ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور بہت افسوس ہوتا ہے۔ تو اپنی ٹیم کو کہنا چاہوں گی کہ پلیز جم کر کھیلیے گا اور سب کی امیدوں پر پورا اتریے گا اور صرف پاکستان کو نظر میں رکھ کر کھیلیے گا۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"جی... میں بس اپنے لیے یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مجھے توفیق دے کہ میں دوسروں کے کام آؤں اور میرے اردگرد جو لوگ ہیں ان کے دل کبھی بھی میری وجہ سے نہ ٹوٹیں اور نہ ہی وہ دکھی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یمنیٰ زیدی سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔





شادی مبارک ہو

مہا جاوید، ہرشایان احمد

آسیہ رزاقی

بارے مہا کی مایوں کی رسم 19 دسمبر کو ہو گئی۔ بڑی تیاری تھی۔ ابٹن، ہنڈیاں، پیلے کپڑے۔ ایک خاص ماحول۔ مجھے تو شادی کی رسموں میں یہ رسم بہت پسند ہے۔ شادی کا آغاز۔ روٹھے ہوؤں کو منانا آسان، کہ چپکے سے ابٹن پیچھے سے آکر لگا دیا۔ ادھر سے بھی ہنستے ہوئے یہی کارروائی کی گئی۔

ساری لڑائی یا اختلاف ابٹن نے مٹا دیا۔ البتہ چہرہ بھی رنگ گیا تو کوئی بات نہیں۔ دوستی کی بنیاد مضبوط ہونی چاہیے۔ ہاں کبھی کبھی منے منائے لوگ بگڑ جاتے ہیں کہ بھئی اتنی محنت سے کیا ہوا میک اپ خراب، بلکہ ستیاناس کر دیا۔

"کون بینڈو تھا جس نے ابٹن ایجاد کیا۔ لو جی! ناک کان میں بھی ابٹن بھر گیا۔" یہ بھی ہوتا ہے۔

"ارے بدتمیزی ہے۔ لو بھلا دوسروں کے گھر میں واش روم میں جا کر منہ دھوؤ اور مجھے تو ابٹن کی مہک ہی بری لگتی ہے۔" (تو منہ نہ دھوؤ۔ ٹشو سے صاف کر لو بھئی۔)

مایوں کا چھوٹا سا فنکشن مہا کے چھوٹے چچا تنویر کے گھر پر تھا۔ انہوں نے لان میں پیلا شامیانہ لگا کر پھولوں اور لائٹوں سے سجایا تھا۔ گھر کے ہی قریبی عزیز تھے۔ یعنی مہا کے چچا، چچیاں، پھوپھیاں، کزنز اور ہم جیسے غریب الوطن لاہور اور ایبٹ آباد کی سردی کھا کر کراچی کے متوازن موسم کا لطف لے رہے تھے۔

مہا... ہماری بھانجی نمبر چار۔ اعلا تعلیم یافتہ بہترین فوٹوگرافر۔ کسی اعلا درجے کی ماڈل سے بڑھ کر سڈول اور دراز قد... مجھے کراچی آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ آ

کر پہلے 'مہا کا سوئٹر بنایا۔ دولہا کے لیے لاہور میں ہلکہ ایبٹ آباد میں ہی بنالیا تھا۔۔۔ پھر مونگ کی پینڈیاں بنائیں۔ رسم کے لیے سوجی کی پینڈیاں زیادہ تعداد میں۔

موسم بے حد خوشگوار ہے۔ بون وستا کی گیارھویں منزل تہمینہ کا نیا فلیٹ۔ اپنی وسعت اور کشادگی کے ساتھ مہمانوں کو باآسانی سمونے کو تیار۔

دوپہر میں عائشہ لاہور سے آئیں۔ یہ ہمارے تایا سید ہاشمی فرید آبادی (آکا جان) کی نواسی ہیں۔ امریکی شہری ہیں۔ لاہور آئی تھیں' ہمارے چچا سید مطلبی فرید آبادی کے پرپوتے کی شادی میں۔ جو اشفاق احمد قدسیہ بانو کی پوتی سے ہوئی ہے۔ ایک پنتھ دو کاج کے محاورے کو سچ بنانے کراچی مہا کی شادی کے لیے آ گئیں۔

رسم ہو چکی تھی تو سلمہ (بھانجی نمبر ایک) اپنی امی اور ممانی' رمانہ (مسز انس) کے ہمراہ آئیں۔ حسب معمول جہاز لیٹ تھا۔ علی ارسلان کے گھر سے آئی تھیں تیار ہو کر۔ مسز ارسلان اور ان کے بیٹے بھی تھے۔ کھانا ہو رہا تھا تو یہ لوگ پہنچے۔ ابٹن والے دن کے لیے ایک گلوکار کی خدمات حاصل کی گئی تھیں' لیکن اس سے پہلے پشاور کے المناک سانحے نے سب کو رلا دیا تھا۔ دل چیر دیے تھے۔ قومی المیہ۔

مہا کے ابا جاوید نے وہ پروگرام کینسل کر دیا۔ اتنے بڑے دردناک المیے کے بعد کس دل سے خوشیاں منائی جاتیں۔ ہر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

مہمانوں نے تو بس رسما" مہا کے ابٹن لگایا۔ بھائیوں نے دل کھول کر اس کے منہ پر ابٹن کا پلاسٹر کر دیا۔ نہ جانے کس بات کا بدلہ لیا تھا بے چاری سے۔ موقع نہ تھا کہ لڑتی۔ (اور ضرور لڑتی)

مہندی تو بڑے پیمانے پر ڈیفنس کے ہال لان میں مشترکہ تھی۔ وہ ملتوی نہیں کی جا سکتی تھی۔ تہمینہ نے مہندی کی مناسبت سے بہت خوب صورت ڈریس مہا کا بنوایا تھا۔ کام دار اورنج کلر کی لمبی قمیص۔ سبز خوش رنگ دوپٹہ۔ پہلے دولہا دوستوں اور بھائی کے نرغے میں دوپٹے کے زیر سایہ لائے گئے۔

اسٹیج بہت اچھا سجایا ہوا تھا۔ مہا بھائیوں کے ہمراہ کام دار دوپٹے کی چھاؤں میں نمودار ہوئیں۔ کزنز ان سے آگے گولڈن روشن لالٹینیں لیے ہوئے تھیں۔ جدت' ایک جدت اور۔ یعنی مہا کے زیور۔ ماتھا پٹی بھی لگائی تھی۔ واہ زبردست' اچھا انتظام تھا۔ بھرپور روشنیاں' تصویریں بنتی رہیں۔

ہم نے تو اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بھئی کرسی بہت پیاری ہوتی ہے۔ پل میں چھن جاتی ہے۔ ناپائیدار۔ میٹھی دہی پھلکیوں اور شوارما سے تواضع ہوئی۔ پھر کھانا ہوا۔ کب رسم ہوئی۔ کیا ہوا۔ خبر نہیں۔ کرسی چھوڑنے کی ہمت نہ کی۔ بس شور شرابہ ہوتا رہا۔ خیر گاجر کا حلوہ' گرم جلیبیاں آرہی تھیں۔ اچانک یاد آیا۔

ابٹن کی رسم کے لیے سعدیہ (مہا کی بھابھی) نے جو گلاب جامنیں بنائی تھیں وہ تو ہم نے چکھی تک نہیں تھیں۔ اس لیے مہندی پر حلوہ' جلیبی کو ہاتھ نہ لگایا۔ گھر جا کر سعدیہ کی گلاب جامن کھانے کے شوق میں۔ البتہ پتا چلا کہ قلفہ بھی تھا۔ جس سے ہم محروم رہے۔ وہ تو کھایا جا سکتا تھا۔

گھر آکر گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ اچھا ہوا کہ وقت پر یاد آگیا' ورنہ وہ بھی نہ ملتیں۔ کیونکہ ہمارے کھاتے ہی سب ختم۔ ابٹن کے لیے مہا کی چچی نگہت میدے کی پینڈیاں بنا کر لائی تھیں۔ اور پھوپھی زہی نے گلاب جامنیں بنائی تھیں۔ ہر سمت میٹھاپن۔ بیگم انور کا دال کا حلوہ الگ۔

دولہا کا جوڑا بھیجنا بھی ایک مرحلہ۔ بے حد نفاست کے ساتھ سجا بنا کر۔ خوب صورتی اور مہارت سے باسکٹ کی آرائش کی گئی۔ اس میں پینڈیاں' مٹھائی' چاکلیٹ رکھ کر ساتھ ہی شیشے کے بڑے بڑے کپ سنہری روپہلی لیس سے آراستہ کرکے اس میں ڈرائی فروٹ بھر کر سمدھیانے بھیجے گئے۔

ادھر سے بھی مہا کا شادی کا جوڑا مٹھائی اور پھولوں سے سجا کر' بانٹنے والی مٹھائی بھی چھوٹی ڈھکن دار باسکٹوں میں سلیقے سے رکھ کر مہا کی ساس شاہانہ چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لائیں۔

شادی 25 دسمبر کو کلفٹن کے پام ایمرلڈ مارکی نزد ڈولمن مال میں منعقد ہوئی۔ پھولوں کی بہار ہر سمت نظر آئی۔ رنگ برنگے موسمی پھولوں کے گلدستے بہار کی نوید دے رہے تھے۔

سسرال سے سرخ غرارہ سوٹ اور روبی کا سیٹ آیا تھا۔ خالصتاً" روایتی دلہن۔ دولہا شایان بھی شیروانی میں پھولوں کے ہار کے ساتھ مشرقی دولہا بنے ہوئے تھے۔ ارمان تو پورے کرنے تھے۔ والدین کے بھی اور اپنے بھی۔ کھانا بہت ہی زبردست اور مختلف تھا۔ بے حد لذیذ۔ عمر بھی صبح کوئٹہ سے آگیا تھا۔ پچھلے دنوں ہی یہ صاحب شادی میں باندھے گئے ہیں۔ دلہن مریم بھی اپنے کام کے سلسلے میں کراچی آئی ہوئی تھی۔ وہ پی سی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ عمیر بھی وہیں چلا گیا تھا۔

ان دونوں کی موجودگی سے سب کو خوشی ہوئی۔ مجھے تو ایک پرس دے کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ سلامیاں سنبھال کر پرس میں رکھنے کی ذمے داری' بلکہ پابندی کے ساتھ کہ جی اب یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔ گفٹ بھی وہیں رکھے جارہے تھے۔ پھر تو تمام خواتین یعنی کہ عزیز خواتین اپنے اپنے پرس اور شالیں میرے پاس رکھ رکھ کر بے فکر ہو کر چلی گئیں۔ اسٹیج بھی بہار دکھا رہا تھا۔ لگتا نہ تھا کہ یہ موسم خزاں ہے۔ تصویریں بنتی رہیں۔

نکاح پر بہت اچھی دعا ہوئی۔ اللہ دولہا دلہن کو اپنی امان میں رکھے۔ خوشیوں کے ساتھ۔ سب کی امیدیں پوری کریں آمین۔ اور اے اللہ تمام پاکستان کے لوگوں کی حفاظت کرے۔ ان کی جان اور آل اولاد کی بھی اللہ حفاظت کرے۔ آمین ثم آمین۔ دہشت گردوں سے ملک کو پاک کردے۔ آمین۔ رخصتی قریباً" ایک بجے ہوئی۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

اگلے دن محتشم اور سعدیہ ناشتا لے کر بہن کی سسرال گئے۔ یہ آرام کا دن تھا۔ (ہمارے لیے) تہمینہ تو انتظام میں مصروف تھیں۔ بچا ہوا کھانا ماسیوں، چوکیداروں، ڈرائیور وغیرہ کو بانٹنے کا کام۔ تھوڑا کھانا اپنے لیے فریزر میں، پارو کے ہاں بھجوایا۔ کچھ پڑوسیوں کو بھی بھیجا۔ اس کے اگلے دن مہا کی چھوٹی پھپھو فاخرہ کے گھر برنچ پر بلایا گیا تھا۔ بہت اچھا کھانا ناشتا تھا۔ گھر آ کر ولیمہ کی تیاری۔ خاصی گہما گہمی رہی۔

ولیمہ پی اے ایف میوزیم کے کنونشن ہال میں تھا، جو کہ بہت ہی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مہا کا ولیمہ کا جوڑا بھی سسرال سے آیا تھا۔ شاہانہ (ساس) نے دونوں جوڑوں میں اپنے ارمان نکالے تھے۔ بہت شاندار لباس تھے۔ ماشاء اللہ شادی تو مکمل ہو گئی۔ سب ہی مطمئن اور خوش تھے لیکن دوسرے شہروں سے آنے والوں کو واپسی ... مشکل ... پنجاب دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

علی سفیان آفاقی کی علالت کے باعث وہ اور لبنیٰ نہیں آسکے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی نادیہ ملتان سے لاہور اپنے پاپا کی تیمارداری کے لیے چلی گئی۔ بیٹی بیٹے کو شادی میں کراچی بھیج دیا۔ اب ان دونوں کو ملتان لے کر جانا پارو کی ذمے داری تھی، جو بچوں کی خالہ ہیں۔ نادیہ نمبر دو، ماشاءاللہ بجی ہیں پارو نمبر تین۔

شادی میں عینی نے ہم سے پوچھا۔

”آپ نے دو بھانجیوں کا ذکر تو خوب کیا ہے۔ دو کا کم۔ انہیں سلمہ اور پارو سے ملوایا کہ دونوں کے ہی ذکر زیادہ تھے۔ اب سنئے ملتان جانے کے لیے بچوں کو لے کر ایئرپورٹ پہنچ گئیں پارو بیگم۔

ملتان میں دھند بہت تھی۔ فلائٹ کینسل۔ اگلے دن لاہور روانہ فلائٹ کی بکنگ ہو گئی۔

وقت پر سفیان علی پارو کو ایئرپورٹ لے گئے۔ جہاز روانہ ہو گیا تو گھر آ گئے۔ (اتفاق کہ پارو کے والد علی سفیان آفاقی، شوہر سفیان علی۔) لاہور سے لبنیٰ نے یہاں داماد سفیان کو فون کر کے بتایا کہ جہاز رن وے پر لینڈ نہ کر سکا۔ واپس کراچی چلا گیا۔ بھاگم بھاگ سفیان پھر ایئرپورٹ بیگم کو وصول کرنے پہنچے۔ کراچی ایئرپورٹ پر انہیں اگلے دن کی فلائٹ کی نوید سنائی گئی۔ بچے تو خوش۔ ہم لوگ اگلے دن ان کے گھر پہنچے۔ سو رہی تھیں بے فکری خاتون۔ جگا کر انہیں سمجھایا، پارو اب آج تو تم چلی ہی جانا۔ بیچارے سفیان کو مزید سزا نہ دو۔

مل ملا کر، واپس آئے۔ تہمینہ نے کچھ دیر بعد فون کیا۔ ان کا جواب آیا۔ آج کی وہ فلائٹ نہیں ملی۔ اور ہمیں مختلف لوگوں سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم نے خوب چیخ پکار کی تو اب وہ ہمیں اسلام آباد بھیج رہے ہیں۔ (یقیناً پارو نے سب کو زچ کر دیا ہو گا۔ اس لیے کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اب وہ اگلے دن بس سے لاہور جائیں گی۔ یوں تو سب ہی مہمانوں کی فلائٹ لیٹ ہوئی۔ مگر ہاشم بیچارہ جو تین بجے کی فلائٹ سے جانے کے لیے ایک بجے گھر سے چلا گیا۔ اسے پی آئی اے والوں نے ہر آدھے گھنٹے بعد روانگی کا جھانسہ دے کر ایئرپورٹ پر بٹھائے رکھا۔

ہم سب مہا کے چچا انور کے گھر دعوت اڑا رہے تھے، وہ بیچارہ جہاز کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا جہاز۔ کیا اس وقت دھند نہ تھی؟ کیا یہ بہانہ تھا۔ جہازوں کی کمی اور خرابی کا؟ پی آئی اے کے خسارے کی چھوٹی سی وجہ معلوم ہو گئی۔ حماقت۔ جی۔ جب ہر سال دھند ہوتی ہے۔ تو شام کی فلائٹ ختم کر کے صبح اور دوپہر ہی کی کیوں نہیں کر دیتے؟

نہ مسافروں کو پریشانی ہو۔ نہ اسٹاف پر مسافروں کے زبانی حملے۔ بلکہ ہاتھا پائی بھی۔ کیا صحیح فیصلہ کرنے کا ادراک نہیں یا جرأت کی کمی؟

اب گھر میں سناٹا ہے۔ محتشم اور سعدیہ لاہور گئے ہیں بیٹی زل کو لے کر سعدیہ کی کزن کی شادی میں۔ زل کی رونق لاہور چلی گئی۔ ماشاء اللہ بہت دلچسپ بچی ہے۔



دستک دستک دستک

شاہین رشید



آصف، ملک ریاض

"کیسے ہیں آصف ملک ریاض صاحب؟"

"الحمدللہ بالکل ٹھیک۔"

"ایک بات بتائیں کہ آپ کی پروفائل پہ آپ کا نام Acif لکھا ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟"

"یوں سمجھیے کہ یہ تھوڑی یونیک نیس ہے جب میں کالج میں انٹر کا طالب علم تھا تو ان دنوں ناموں کو بڑے اسٹائلش انداز میں لکھا جاتا تھا تو مجھے اس بات میں زیادہ کشش محسوس ہوئی کہ میں اپنا نام C کے ساتھ لکھا کروں۔ تو میرے ڈاکومنٹس میں تو میرا نام Asif ہی ہے۔"

"کسی نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ کی انگریزی کمزور ہے؟"

قہقہہ "بہت سارے ایس ایم ایس آتے ہیں اور میرے سننے والے، ہیں تو ان کو میں نے وضاحت بھی کر دی ہے پھر میں نے اس پہ تھوڑی سی ریسرچ بھی کی تو مجھے پتا چلا کہ Vowel کے بعد آپ کوئی بھی لفظ استعمال کر سکتے ہیں' اور C کا استعمال بھی غلط نہیں ہو گا تو یہ انگریزی کے حساب سے غلط نہیں ہے' اور پھر میرے سننے والوں نے بھی اسے پسند کیا تو میں نے Acif ہی رہنے دیا۔"

"آپ کی آواز جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ بہت عمدہ ہے، تو کالز تو بہت آتی ہوں گی؟"

"بالکل جی... آواز کی وجہ سے بہت پسند کرتے ہیں میرے چاہنے والے اور میرا اسٹائل بھی کچھ ایسا ہے کہ سب ہی پسند کرتے ہیں اور آج کل جو شوز کر رہا ہوں وہ بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔"

"کیا شوز ہیں آج کل آپ کے؟"

"آج کل میرے ویک اینڈ کے شو ہیں۔ ویک اینڈ نائٹ شو اور سنڈے کو چل آؤٹ شوز ہوتے ہیں۔ تو بڑا مزا آتا ہے ایک ماحول بنا لینا۔ تو ایسے پروگراموں میں آواز کا اتار چڑھاؤ لوگوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ نوجوان آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

"جی ہاں... لیکن میری آواز سن کر کم عمر نوجوان سمجھتے ہیں کہ شاید میں تیس سے اوپر کا نوجوان ہوں اور جب میں لوگوں کو اپنی صحیح عمر بتاتا ہوں تو وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ کوئی مانتا ہی نہیں کہ میں پچیسویں سالگرہ منا کر چھبیسویں میں داخل ہوا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ کہ میں تصاویر میں بھی اٹھائیس انتیس کا ہی لگتا ہوں۔"

"کچھ لوگ اپنی شخصیت کی بدولت کماتے ہیں اور

کچھ آواز کی بدولت تو آپ کے پاس دونوں چیزیں ہیں تو اسکرین پہ بھی آجائیے؟"

"مجھے اداکاری کا بھی شوق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے کہ میں اسکرین پہ آؤں۔۔۔ تو ان شاء اللہ بہت جلد ٹرائی کروں گا ڈراموں کے لیے۔ ویسے اسکول اور کالج کے زمانے میں تو اپنا ہر شوق میں نے پورا کیا۔"

"آپ کی شکل معروف فنکار ہمایوں سعید سے بھی ملتی ہے تو آپ بہت جلد اپنی جگہ بنالیں گے۔ ماڈلنگ کا بھی شوق ہے؟"

"بے شک میری شکل ان سے ملتی ہے اور مجھے بہت لوگوں نے کہا بھی ہے مگر میں جگہ بناؤں گا تو اپنی شخصیت سے اپنے ٹیلنٹ سے اور ماڈلنگ کا شوق نہیں ہے مجھے۔ اگر ٹی وی پہ آیا بھی تو یا تو بحیثیت "ہوسٹ" کے یا پھر اداکار کے۔۔۔ اور ہوسٹ بنوں گا تو کسی رات کے پروگرام کا کیونکہ صبح صبح اٹھنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔"

"یہ نوجوانوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ یہ صبح دیر تک سوتے ہیں اور رات دیر تک جاگتے ہیں؟"

"یہ تو خیر ایک کامن سی بات ہے۔ ویسے میں اپنے شوز میں بھی لوگوں کو اور نوجوانوں کو جگاتا اور ہنساتا رہتا ہوں۔ لیکن خود بھی انہی میں سے ہوں۔ سنڈے کو بارہ ایک بجے شو کرنے جانا اور سنڈے کی نیند خراب کرنا اور سٹرڈے نائٹ شو کرکے گھر جانا مشکل کام ہے ۔۔۔ مگر شاید ہم نوجوانوں کے خون میں یہ بات سرکولیٹ کرچکی ہے کہ صبح اٹھنے کو نوجوان جرم سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہ کوئی ایسا کام ہے جو ہم غلط کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور میری والدہ تو اس حوالے سے بہت سخت ہیں۔ وہ صبح گھڑی کا ٹائم پیچھے کرکے مجھے جگاتی ہیں۔ کہ نو بج گئے اٹھ کر دیکھو تو آٹھ بجے ہوتے ہیں۔ تو ان کے اٹھانے کا اپنا انداز ہے۔ اور میں بھی ٹائمنگ کا بہت خیال رکھتا ہوں۔"

"کامیابی کی پہلی سیڑھی وقت کی پابندی ہے۔ کیونکہ جو وقت کو ضائع کردیتے ہیں وقت انہیں ضائع کردیتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ میرے کام پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔"

"ریڈیو کی کمائی سے گھر چل سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔ ریڈیو تو بس ایک شوق ہے۔ اس لیے میں جاب بھی کرتا ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں اور بڑا شکر ہے کہ اچھا خاصا کمالیتا ہوں۔"

"وہ کون سا ایسا ٹائم ہوتا ہے جب لوگ بہت زیادہ ریڈیو سنتے ہیں اور کون سا ایسا ٹائم ہے جب لوگ بالکل نہیں سنتے یا کم سنتے ہیں؟"

"دو باتوں کی وضاحت کردوں ایک تو یہ کہ لوگ ریڈیو سن کب رہے ہیں اور دوسری یہ کہ ریڈیو سننے کے بعد فیڈ بیک دینے کی پوزیشن میں کب ہوتے ہیں' اب جو چھ سے آٹھ بجے والے اور آٹھ سے دس والے شو ہوتے ہیں ان میں لوگ کام کررہے ہوتے ہیں۔ یعنی ستر فیصد لوگ اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں یا گھر آرہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ سن ضرور رہے ہوتے ہیں لیکن وہ فیڈ بیک نہیں دے پاتے فیڈ بیک ملتا ہے' رات دس بجے سے شروع ہونے والے پروگراموں کا جو رات تین سے چار بجے تک جاری رہتے ہیں۔ سنڈے کے شو میں فیڈ بیک زیادہ آتا ہے اور سٹرڈے سے ڈبل فیڈ بیک آتا ہے۔ تو آئیڈیا ہوجاتا ہے کہ لوگ توجہ سے سن رہے ہیں۔"

"دوران شو کن باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے؟"

"دوران شو ان باتوں کا خیال رکھیں کہ آپ سے کوئی ٹیکنیکل غلطی نہ ہوجائے۔ مطلب یہ کہ ایک وقت میں آپ کے سامنے تین ایل سی ڈی پڑی ہیں آپ کے سامنے پینل ہے' آپ کو کمرشل ٹائم پہ چلانے ہیں۔ آپ کو اذان ٹائم پہ چلانی ہے۔ نیوز والے کو ٹائم دینا ہے یہ چیزیں ٹیکنیکل ہیں اور اس کے لیے آپ کے دماغ کا حاضر ہونا بہت ضروری ہے۔ چھوٹی



سی بھی غلطی آپ سے ہو گئی تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی اور آپ کے لیے ہینڈل کرنا تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔"

"پڑھائی میں کیسے تھے آپ اور پریکٹیکل لائف میں کب آئے؟"

"میٹرک تک تو اے ون گریڈ آتے تھے پھر انٹر میں گریڈ نیچے آ گئے اور گریجویشن میں بھی ایسا ہی ہوا ... اور شاید ایسا اس لیے ہوا کہ میں نے کم عمری میں ہی جاب شروع کر دی تھی یعنی انٹر کے بعد ہی 'انٹر کے رزلٹ سے پہلے ہی۔ مجھے احساس ذمہ داری تھا اس لیے میں فارغ نہیں بیٹھا۔"

"شادی...؟"

"میری والدہ کا تو خیال تھا کہ بائیس تیئس سال کی عمر میں شادی ہو جانی چاہیے مگر اب دور بدل چکا ہے۔ اس لیے اسٹیبلش ہونے کے بعد ہی شادی کرنی چاہیے۔"

"کھانے پینے کا شوق ہے؟"

"کھانے پینے کا شوق ہے۔ مگر بچپن سے تربیت ایسی تھی کہ جو بھی ملے ہنسی خوشی کھالو۔ اور جس حال میں جو بھی ملے کھاؤ... اور جو بھی ملے پہنو اس لیے نخرے نہیں کرتا... اور اس لحاظ سے میرے گھر والے بھی لکی ہیں کہ میں نے کبھی نخرے نہیں دکھائے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ وقت اب تو خیر ملتا ہی نہیں ہے۔ بس ایک لیپ ٹاپ ہوتا ہے اور میں ہوتا ہوں۔ میوزک سے اور کھیلوں کی دنیا سے لگاؤ ہے۔ کرکٹ سے بہت اچھا تعلق رہا۔ بہت میچ جیتے' فاسٹ باؤلر تھا۔ مگر اسے جاری نہیں رکھ سکا۔ اگر پریکٹس میں رہتا تو شاید بہت اچھا فاسٹ باؤلر ہوتا اور آل راؤنڈر بھی ہوتا۔ اگر کم عمری میں جاب نہ کرتا تو پھر کرکٹ میں ہوتا۔"

یاسرہ رضوی

"ہیلو جی... کیا حال ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے... آپ کیسی ہیں۔"

"آپ کی دعا ہے... ملکہ عالیہ میں دیکھ رہی ہوں ماشاءاللہ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں ہمیشہ کی طرح... کیسا رسپانس مل رہا ہے؟"

"بس جیسا ہمیشہ ملتا ہے کہ جی بہت اچھا کر رہی ہیں... بہت پسند آ رہا ہے آپ کا کام... ایسے ہی اچھے رول کرتی رہیے گا... وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ کو خود کو کیسا لگ رہا ہے؟"

"مجھے اچھا لگ رہا ہے اور میں وہی رول کرتی ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ورنہ عام سیدھے سادے رول تو بہت ملتے ہیں۔ مگر میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نے ڈراموں کی تعداد نہیں بڑھانی بلکہ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد دکھانا ہے تاکہ لوگوں کو میرا کام یاد رہے۔"

"بالکل جی... یہ کوالٹی تو آپ میں ہے... اس لیے تو آپ کا سیریل "من کے موتی" بہت پسند کیا گیا اور آپ کے سیریل "مجازی خدا" کو بھی لوگ نہیں بھولے کہ اس میں بھی پرفارمنس بہترین تھی؟"

"ہاں جی... دونوں سیریل ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اور جس زمانے میں یہ سیریل ایک ساتھ چلے، میرے لیے بہت فائدے مند رہے کہ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ یاسرہ میں کام کرنے کی ورائٹی بھی ہے... اگر وہ سیدھے سادھے کردار کر سکتی ہے تو ماڈرن کردار بھی کر سکتی ہے۔"

"سگریٹ بھی خوب پی آپ نے مجازی خدا میں مشکل ہوئی یا...؟"

"یا... کیا؟ ایسا کچھ نہیں ہے کہ مجھے عادت ہے... زندگی میں ایک آدھ کش تو ہر کوئی لگا لیتا ہے... شروع شروع میں تھوڑی کھانسی اور گلے میں خراش ہو جاتی تھی۔ پھر ٹھیک ہو گیا... ویسے سگریٹ نوشی کے سین زیادہ نہیں تھے۔"

"من کے موتی" اور اب ملکہ عالیہ... دونوں میں انتہائی سمپل رول... کیوں؟"

"کیوں کی کوئی بات نہیں... دونوں رول میرے حساب سے اچھے تھے۔ اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ پسند کیے جائیں گے اس لیے میں نے انہیں کرنا پسند کیا۔ بس کرداروں میں جان ہونی چاہیے... سیدھے اور ماڈرن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تو ڈرامہ سائن کرتے وقت آپ کردار کو اہمیت دیتی ہیں... رائٹر اور ڈائریکٹر کو نہیں؟"

"ایسا کچھ نہیں اچھا ڈائریکٹر ہمیشہ اچھی اور جاندار کہانیوں پر ہی کام کرتا ہے اس لیے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کام اچھا ہوگا... میں ڈائریکٹر کے علاوہ سب سے پہلے اپنا کردار دیکھتی ہوں اور پھر سائن کرتی ہوں۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ اتنی شہرت کے باوجود آپ سپورٹنگ رول بھی کر لیتی ہیں... اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"اس لیے کر لیتی ہوں کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ سپورٹنگ ہے یا لیڈنگ ہے۔ بس جو کردار میرے دل کو اچھا لگتا ہے وہ میں کر لیتی ہوں۔ آپ ابھی سیدھے رول کی بات کر رہی تھیں تو میں نے ایک ٹیلی فلم میں گاؤں کی ایک لڑکی جو کھلونے بیچتی ہے کا رول بھی کیا ہے اور کوئی پہچان نہیں سکا کہ میں نے روپ دھارا ہوا ہے۔ سب اصلی والی سمجھ رہے تھے مگر کیمرے وغیرہ دیکھ کر انہیں اندازہ ہوا کہ یہ گاؤں والی نہیں ہے بلکہ شہر سے آتی ہے۔"

"پھر تو خوب آؤ بھگت ہوئی ہوگی؟"

"جی جی... گاؤں کے لوگ بہت مخلص اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ بہت اچھے دن گزرے ان کے ساتھ۔ بہت محبت دی سب نے۔"

"آپ خود بھی تو رائٹر ہیں۔ کیا لکھنا اچھا لگتا ہے۔ سوپ سیریل یا پھر ٹیلی فلم؟"

"میں ٹیلی فلم کو ہی پسند کرتی ہوں اور میں رائٹر بھی ٹیلی فلم کی ہی ہوں... مجھے اچھا لگتا ہے کہ کوئی ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پورا ڈرامہ دیکھ لے... آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ سیریل کے لیے بھی لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے تو سوپ کے لیے تو بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ دونوں طرح کے ڈرامے تواتر کے ساتھ بن رہے ہیں تو ٹائم ہے نا لوگوں کے پاس تب ہی تو دیکھتے ہیں۔"

"آپ کا ملکہ عالیہ بھی تو دیکھا گیا۔ کافی لمبا چلا تھا وہ بھی اور من کے موتی بھی کافی لمبا گیا؟"

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ لوگوں کے پاس ٹائم ہے تو لوگ دیکھتے ہیں۔ میں تو اپنی پسند کی بات کر رہی ہوں کہ مجھے فلم بنانا، لکھنا اور دیکھنا پسند ہے۔"

"مصروفیات میں گھر تو نظرانداز ہوتا ہوگا؟"

"نہیں جی... بچپن سے ہی گھر گرہستی کی عادت ڈال دی تھی ماں نے اس لیے مصروفیات کے باوجود گھرداری میں حصہ ضرور لے لیتی ہوں۔ بہت اچھا پکا لیتی ہوں... اور یہ امی کی تربیت ہی تو تھی کہ جب امریکہ پڑھنے گئی تو وہاں اپنے گھر کے سارے کام خود کرتی تھی۔"

"مطلب تعلیمی قابلیت؟"

"ہیومن ریسورس کی ڈگری کے لیے امریکہ گئی اور ماس کمیونیکیشن کے لیے برطانیہ گئی تھی۔"

"پھر تو آپ کو خاصا ماڈرن ہونا چاہیے تھا؟"

"ہاں... تھوڑی ماڈرن ہو گئی تھی۔ مگر پھر یہ سب کچھ اپنی نیچر کے خلاف لگا۔ بس اسی لیے اپنی طبیعت پہ لوٹ آئی۔ مجھے اس طرح سادہ رہنا اچھا لگتا ہے۔"

راشدہ رفعت

محبت تو لگی ہے

ناولٹ

ہلکا پھلکا بخار اور معمولی سا فلو..... آفس سے چھٹی کرنا بنتا تو نہ تھا لیکن وہ اپنے موڈ کا کیا کرتا۔ کبھی کبھار تو بندے کو اپنے دل کی بات ماننا ہی پڑتی ہے نا۔

اور آج ایسا ہی دن تھا۔ وہ رات کی بھرپور نیند کے بعد صبح اٹھ کر ایک بھرپور ناشتا کر چکا تھا اور اب بہت اطمینان سے اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اماں پڑوس میں اپنی کسی جاننے والی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ڈور بیل بجی تھی۔

''حیرت ہے' اماں اتنی جلدی آگئیں۔'' حارث اخبار میز پر رکھ کر گیٹ کھولنے گیا تھا۔ آنے والی اماں نہ تھیں۔ اماں کی گھبرائی بوکھلائی سی عزیز از جان بھانجی صاحبہ گیٹ کھلنے کے انتظار میں کھڑی ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ دوسری جانب اپنی خالہ جان کے بجائے ان کے سپوت کو دیکھ کر محترمہ کی گھبراہٹ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ حارث نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ حارث کو منمناتا سا سلام کر کے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

''اماں ذرا پڑوس تک گئی ہیں۔ تم بیٹھو میں اماں کو.....''

حارث نے ہانیہ کے سلام کا جواب دے کر اسے آگاہ کرنا چاہا تھا مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر بول پڑی تھی۔

''کیا کہا آپ نے' خالہ جان گھر پر نہیں ہیں۔'' خوف زدہ سا لہجہ اور انداز ایسا جیسے کہ ابھی واپسی کے لیے دوڑ لگا دے گی۔

''اماں اپنا سیل فون ساتھ لے گئی ہیں۔ میں انہیں کال کر کے بلا لیتا ہوں' قریب ہی گئی ہیں۔ پانچ منٹ میں آجائیں گی۔''





حارث نے اسے بے حد رسانیت سے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر چھایا تذبذب ابھی بھی کم نہ ہوا تھا۔ حارث نے اس کے ساتھ مزید دماغ کھپانے کے بجائے لاؤنج میں چارجنگ پر لگا اپنا موبائل فون اٹھا کر اماں کو فون کر دیا۔ محترمہ کی تسلی کے لیے اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔

"ہانیہ آئی ہے۔ اچھا اچھا۔ بٹھاؤ میری بچی کو۔ میں دو منٹ میں آئی بس۔"

خالہ کی آواز سن کر "بچی" خود ہی صوفے پر ٹک گئی تھی۔ حارث اس کی مزید تسلی کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا' ہانیہ اس کی گھر میں موجودگی کی توقع نہ کر رہی ہوگی۔ ہر دس پندرہ دن بعد وہ اپنی خالہ کے پاس اپنے دکھڑے رونے آتی تھی۔ لیکن چھٹی والے دن آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ اماں کی زبانی اسے ہانیہ کی آمد کا علم ہوتا اور نہ صرف اس دن بلکہ اس سے اگلے دن بھی اماں کی زبان پر اپنی بھانجی کا ہی تذکرہ رہتا۔

"بے چاری بچی جی کا بوجھ ہلکا کرنے آجاتی ہے میرے پاس۔ آپا اور بھائی صاحب نے کیسا لاڈوں میں پالا تھا۔ تینوں بھائی بھی جان چھڑکتے تھے۔ ماں باپ کا تو چلو اللہ کے پاس سے بلاوا آیا' چلے گئے لیکن نگوڑمارے بھائی' اپنی آنکھیں اور کان اپنی اپنی بیویوں کے پاس گروی رکھ دیے۔ کم بخت ماریوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ بے چاری ہانیہ کا۔"

اماں کے پاس تو سنانے کو اور بھی کچھ ہوتا تھا لیکن حارث کو ہانیہ کے نگوڑمارے بھائیوں اور کم بخت ماری بھابھیوں کے تذکرے سے چنداں دلچسپی نہ تھی' پھر بھی اسے اماں سے اکثر ہانیہ نامہ سننا پڑتا تھا۔

ہانیہ' اماں کی مرحومہ بہن کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ خالہ' خالو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور اب وہ اپنے بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے حالات اتنے بھی قابل رحم نہیں تھے۔ اچھا پہنتی اوڑھتی تھی۔ گھر کے کاموں کا بھی خاص بوجھ نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی معمولی باتیں جو گھروں میں ہو ہی جاتی ہیں' ہانیہ کو بہت دل گرفتہ کر دیتی تھیں۔ وہ حساس تو ہمیشہ سے تھی۔ ماں باپ کے گزرنے کے بعد ضرورت سے زیادہ زود رنج ہو گئی تھی۔ کسی بھی چھوٹی سی بات پر پہروں کڑھتی تھی اور جب ضبط کا پیمانہ بالکل لبریز ہو جاتا تو دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے یہاں اماں کے پاس آجاتی۔ رونے دھونے کا طویل سیشن ہوتا۔ اماں اسے چپ کرواتیں۔ ڈھیروں دلاسے دیتیں۔ کچھ نصیحتیں کرتیں۔ دوسرے الفاظ میں ہانیہ اماں سے کتھارسس کروا کر واپس اپنے گھر کی راہ لیتی۔

افشاں آپا یا عینی آپا سسرال سے میکے آئی ہوتیں تو وہ بھی اماں کے ساتھ مل کر ہانیہ کو ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں۔ حارث کے علاوہ سب گھر والوں کو ہانیہ سے دلی ہمدردی تھی۔ خیر اس کے ساتھ کوئی ایسا خاص بیر حارث کو بھی نہ تھا لیکن جو مسئلے لے کر محترمہ یہاں آتی تھیں اور گھر والوں کو بھی جن باتوں کی وجہ سے ہانیہ بے چاری پر ترس آتا تھا۔ حارث کو ان باتوں پر سوائے ہنسی کے کچھ نہ آتا۔

مثلاً" ہانیہ کی گہری سہیلی کی شادی تھی۔ توفیق بھائی کو دو تین دن پہلے سے یاد دہانی کروا رہی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر گاڑی سمیت گھر پر رہیں۔ مقررہ وقت پر توفیق بھائی گھر پر ہی تھے۔ لیکن شوہر کی شکل دیکھ کر نازو بھابھی کو یاد آگیا کہ آج تو انہوں نے اپنی بہن کی نند کا نومولود بیٹا دیکھنے جانا ہے۔ بچے کی پیدائش کو سولہ روز گزر چکے تھے۔ اگر نازو بھابھی ایک دو دن بعد مبارک باد دینے چلی جاتیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔ اس کی گہری سہیلی کی شادی کا فنکشن مس ہوتے ہوتے رہ گیا نا۔ وہ تو شمس بھیا کو اس کی بے چاری سی شکل پر ترس آگیا اور وہ اپنی پھٹیچر سی بائیک پر اسے میرج ہال چھوڑ آئے۔ واپسی کیسے ہوئی' وہ الگ المناک داستان تھی جو ہانیہ بی بی نے ہچکیوں سے روتے ہوئے سنائی اور اماں دوپٹے سے اس کی آنکھیں پونچھتی رہیں۔

شادی کے بعد یہ گہری سہیلی ہانیہ سے ملنے گھر آئی۔ ہفتے بعد اس نے میاں کے ساتھ بیرون ملک چلے جانا تھا۔ نازو بھابھی اور شہلا بھابھی گھر پر تھیں۔ دونوں

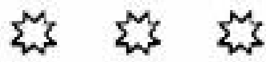
سہیلی سے ملنے تک نہ آئیں۔ ملازمہ کے ہاتھ ڈرائنگ روم میں دو گلاس کولڈ ڈرنک بھجوادی۔ گلاسوں میں اتنی برف ڈال دی تھی کہ کولڈ ڈرنک بالکل شربت ہی بن گئی (یہ ہانیہ کی ہی اصطلاح تھی) اور اسی شام نازو بھابھی کے بہن، بہنوئی گھر آئے تو طرح طرح کے لوازمات سے پوری میز سج گئی۔ بلکہ

انہوں نے شامی کباب تلنے کو ہانیہ سے ہی کہا اور شامی کباب تلتے ہوئے گھی کا ایسا چھینٹا کلائی پر پڑا کہ اچھا خاصا آبلہ بن گیا اور جب ہانیہ مہمانوں سے سلام دعا کرنے گئی۔ بھابھی کی بہن نے اس کی اسٹڈیز کے متعلق ایک دو سوال پوچھے تو نازو بھابھی نے مہنگائی کا رونا شروع کر دیا۔ درپردہ وہ ہانیہ کو سنانا چاہ رہی تھیں کہ اس کے تعلیمی اخراجات کی وجہ سے گھر کے خرچوں میں کیسی تنگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اور چھوٹی بھابھی شاپنگ پر گئیں تو رسماً "ہانیہ سے بھی پوچھ لیا کہ اسے کچھ چاہیے تو نہیں۔ اس کا ہینڈ بیگ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اس کا اسٹرپ بھی بس ٹوٹنے ہی والا تھا تو اس نے بھابھی سے کہا کوئی مناسب قیمت والا ہینڈ بیگ لے آئیں، اور چھوٹی بھابھی جن کی چوائس کا ایک زمانہ گرویدہ تھا' وہ اس کے لیے ایسا بد رنگا اور بدوضع بیگ اٹھالائیں کہ ہانیہ کبھی حیرت سے بھابھی کا منہ دیکھتی اور کبھی بیگ کا۔ اور رات کے کھانے کے بعد چھوٹی بھابھی کے کمرے سے چھوٹے بھیا کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ خاصے کنجوس تھے اور بیوی سے اس فضول خرچی کے بارے میں باز پرس کر رہے تھے تو چھوٹی بھابھی خرچے کی وضاحت دیتے ہوئے بار بار ہانیہ کے ہینڈ بیگ کا ہی ذکر کرتی رہیں۔ ہانیہ اس وقت کو کوستی رہی جب اس نے ہینڈ بیگ کی فرمائش کی تھی۔ ایک دفعہ جب اسے بخار ہوا تو وہ دو دن تک بھیا کے میڈیکل باکس میں سے بخار کی ٹیبلیٹ لے کر کھاتی رہی۔ بھابھیوں اور بھائیوں میں سے کسی کو خیال تک نہ آیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ہی لے جایا جائے۔ وہ تو شکر ہے کہ دو دن بعد بخار خود ہی اتر گیا۔

اسی طرح جب شہلا بھابھی کے سب سے چھوٹے فتنے مطلب بیٹے نے اس کی اہم اسائنمنٹ پھاڑ دی اور اس نے غصے میں بھتیجے کو ایک چماٹا (طمانچہ) رسید کر دیا تو بظاہر تو شہلا بھابھی کچھ نہ بولیں مگر دو دن تک ان کا موڈ آف ہی رہا۔

اسی طرح کے درجنوں قصے تھے جن کو سناتے ہوئے ہانیہ بی بی پر رقت طاری ہو جاتی اور اماں لاڈلی بھانجی کو سینے سے چمٹا کر ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں اور پھر اگلے دو دن تک حارث کے سامنے اماں آب دیدہ ہو کر بھانجی کی باتیں دوہراتی رہتیں۔



دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد اماں سارا دن چپ رہ رہ کر اکتا جاتی تھیں۔ جب وہ آفس سے گھر واپس آتا تو اماں اسے کھانا بعد میں دیتیں' دن بھر کی رپورٹ پہلے دیتیں۔ اسے اماں کی تنہائی کا بخوبی احساس تھا۔ دو سال پہلے ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اماں بہت تنہا ہو گئی تھیں۔ دونوں بہنیں اپنے گھر بار کی تھیں۔ پندرہ بیس دن بعد میکے کا چکر لگتا۔ ماں کے سامنے سسرال والوں کی ڈھیروں ڈھیر غیبتیں کر کے واپس اپنے گھر کی راہ لیتیں' لیکن آج کل بہنوں کے ہاتھ ایک اور موضوع لگ گیا تھا۔ وہ جب بھی میکے آتیں' حارث کی شادی کا ذکر چھیڑ دیتیں اور اپنی ان نندوں' دیورانیوں' جیٹھانیوں جن سے ان کی ایک دن نہ بنی تھی' ان ہی کی بیٹیوں کا نام حارث کے لیے تجویز کرتیں۔ شکر ہے اماں اس معاملے میں حارث کی ہم نوا تھیں۔

"ساری زندگی جن عورتوں کی تیزی طراری کے قصے تم مجھے سناتی رہی ہو' اب ان کی بچیوں کو حارث کے لیے منتخب کر رہی ہو۔ جب مائیں اتنی تیز طرار ہیں تو بچیاں کون سی سیدھی اور معصوم ہوں گی۔ نہ بھئی مجھے اور میرے بیٹے کو بخشو تم۔"

"جیسی سیدھی اور معصوم بہو آپ چاہ رہی ہیں' وہ آج کے دور میں تو ملنے سے رہی۔ جن لڑکیوں کا ہم ذکر کرتے ہیں' وہ ہمارے سامنے پلی بڑھی ہیں۔ ان کے مزاج اور عادتوں سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ تھوڑی بہت تیزی طراری تو کس میں نہیں ہوتی اماں!" افشاں آپا بہت رسانیت سے ماں کو مخاطب کرتیں۔

"ہاں تو اور کیا اماں! باجی بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ الوینہ' نوشابہ' لائبہ اور زرمینہ چاروں بچیاں ہماری آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی ہیں' پھر حارث ہمارا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارا تو میکہ ہی اس کے دم سے ہے' کیا گارنٹی ہے کہ غیروں میں سے کوئی لڑکی لائیں گے تو وہ اس گھر میں ہمارا بھی کبھار کا آنا بھی برداشت کرپائے گی۔ اپنی دیکھی بھالی لڑکی کو بھابھی بنائیں گے تو ہمارا اور ہمارے بچوں کا وجود بخوشی گوارا کرے گی۔" عینی آپا نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ تمہاری سسرالی بچیوں میں سے ہی کسی کو بہو بناؤں۔ تمہیں قرب و جوار میں کوئی اور ایسی لڑکی نظر نہیں آرہی جو دیکھی بھالی بھی ہے۔ سیدھی اور معصوم بھی اور تمہارے بچوں سے بہت پیار بھی کرتی ہے۔" اماں ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھیں۔

عینی آپا اور افشاں آپا نے چونک کر اماں کو دیکھا۔ چونکا تو حارث بھی تھا۔ ابھی تک تو وہ ماں بہنوں کی بحث سے لطف لے رہا تھا لیکن اماں نے اس بار جو فقرہ بولا تھا' اس میں کس ہستی کی طرف اشارہ تھا۔ وہ چند لمحوں میں ہی اس اشارے کو پاگیا تھا لیکن ہوسکتا ہے' اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اس نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔

"ہانیہ کی بات کررہی ہیں آپ؟" عینی آپا نے حیرت سے استفسار کیا۔

"ہاں' میں ہانیہ کی ہی بات کررہی ہوں۔ بولو' کوئی اعتراض ہے تو؟" اماں نے مسکرا کر بیٹیوں کو دیکھا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ حیرت ہے یہ بات ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی۔" افشاں آپا نے فوراً" سے پیشتر تائیدی ووٹ دے ڈالا۔

"تمہارے ذہنوں پر تمہاری سسرالی بچیاں چھائی ہوئی تھیں۔ بتاؤ تو سہی' ان میں سے کوئی میری ہانیہ کے پاسنگ بھی ہے۔" اماں نے تفاخرانہ لہجے میں استفسار کیا۔

"فار گاڈ سیک اماں! آپ اپنی رونی صورت والی بھانجی کو میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہیں۔" حارث کو ماں کی بات سن کر گویا کرنٹ لگا تھا۔

"بس مجھے اسی چیز کا خدشہ تھا۔ اسی لیے اتنے دن سے یہ خواہش اپنے دل میں دبا رکھی تھی۔ سمجھاؤ اپنے بھائی کو ہانیہ سے اچھی لڑکی اور کہاں ملے گی اسے۔" اماں نے بیٹے کو ناراضی سے دیکھا تھا۔

"ہاں تو اور کیا حارث! بتاؤ تو سہی۔ کیا کمی ہے ہانیہ میں شکل و صورت لاکھوں میں ایک' پڑھی لکھی' سیدھی سادی بھولی بھالی اور سب سے بڑھ کر ہماری اپنی۔ آپ کا انتخاب سو فیصد درست ہے اماں! بس پہلی فرصت میں توفیق بھائی وغیرہ کے ہاں جاکر ہانیہ کا رشتہ مانگ لیتے ہیں۔" افشاں آپا تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے چکر میں تھیں۔

"کمال کرتی ہیں آپا آپ! میں کہہ رہا ہوں' مجھے ہانیہ پسند نہیں اس امیچور لڑکی سے مجھے ہرگز شادی نہیں کرنی۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈنی ہے تو ڈھونڈیں' ورنہ یہ کام میں خود کرلوں گا۔" حارث کو غصہ ہی آگیا۔ اس کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اور اس کی رائے کو کوئی اہمیت دینے کو ہی تیار نہ تھا۔

"اچھا خفا کیوں ہوتے ہو۔ بتاؤ تو سہی' کیا کمی ہے ہانیہ میں۔ تمہیں وہ کیوں اچھی نہیں لگتی۔" عینی آپا نے اسے بچکار کر پوچھا۔

"میں نے جب بھی اسے دیکھا ہے' روتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ میرے لیے کیا وہی رونے دھونے والی لڑکی رہ گئی ہے؟" اس نے بگڑ کر پوچھا۔

"تم اس کے معروضی حالات تو دیکھو۔ ماں باپ سر

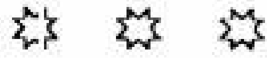
رہیں نہیں۔ بھائی' بھابھیاں اپنی زندگیوں میں مگن۔ گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی بات شیئر کر سکے۔ کوئی چھوٹا بہن بھائی بھی نہیں جس سے لڑ جھگڑ کر دل کی بھڑاس نکال سکے۔ یہاں اماں کے پاس آکر وہ اپنا جی ہلکا کر لیتی ہے' ورنہ ایسی بات تھوڑی ہے کہ وہ ہر وقت روتی دھوتی رہتی ہے۔" افشاں آپا نے بھی لاڈلے بھائی کو بہت پیار سے سمجھایا تھا۔

"کوئی اور بات کریں آپا! جب میں نے کہہ دیا نہیں تو بس نہیں۔" اس نے اکتا کر ان کی بات کاٹی۔

"رہنے دو افشاں! جب اس نے نہ کر دی ہے تو وہ کبھی ہاں میں نہیں بدلے گی۔ اپنے لیے اپنی پسند کی لڑکی یہ خود تلاش کر لے گا۔ تم دونوں اپنے گھر بار کی ہو اور میں نے بھی کتنے دن جی لینا ہے۔ جیسے مرضی لڑکی پسند کرے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اماں بیٹے کی ہٹ دھرمی پر آب دیدہ ہو گئی تھیں۔ حارث جی میں کچھ شرمندہ تو ہوا لیکن جانتا تھا ماں بہنیں اسے قائل کرنے کو اور بھی بہت سے جذباتی اور نفسیاتی حربے استعمال کر سکتی ہیں' سو اس وقت یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔

"میں داؤد کی طرف جا رہا ہوں۔ کل وہ بائیک سے سلپ ہو گیا تھا۔ اچھی خاصی چوٹیں آئی ہیں۔ اس کا حال پوچھ آؤں۔" اس نے اپنے قریبی دوست کا نام لیا۔ ماں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر اور دل مسوس کر رہ گئیں۔ حارث لاکھ فرماں بردار سہی مگر یہ سچ تھا کہ کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام نہ کروا سکتا تھا۔

"تم دونوں کو ہی جلدی پڑی ہوئی تھی بھائی کی شادی کی۔ نہ روز' روز ایسے ویسے رشتے لے کر آتیں تو کاہے کو میں ابھی ہانیہ کا نام لیتی۔ بڑا ٹیڑھا بیٹا ہے میرا۔ بہت طریقے' سلیقے سے قائل کرنا تھا مجھے اس کو۔ موقع محل دیکھ کر بات چھیڑتی۔ تم دونوں کی وجہ سے سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔" اماں اب بیٹیوں پر بگڑ رہی تھیں۔ بیٹے پر آیا غصہ بلاوجہ بیٹیوں پر نکل رہا تھا اور فرماں بردار بیٹیاں چپ چاپ ماں کی ڈانٹ سنے گئیں۔



حارث کو خدشہ تھا کہ اماں دوبارہ یہ موضوع ضرور چھیڑیں گی' لیکن صد شکر اس دن کے بعد اماں نے اس کے سامنے ہانیہ کا نام نہیں لیا تھا اور اب تو کافی دنوں سے محترمہ کی آمد بھی نہیں ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اسے کبھی کبھار ہانیہ کا خیال آجاتا تھا۔ اماں اور بہنوں کی بات یاد کر کے چھم سے محترمہ کا سراپا ذہن کے پردے پر لہراتا' مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر ہانیہ کے تصور بھی ذہن سے جھٹک ڈالتا۔

اور پھر ایک دن ہانیہ صاحبہ گھر آہی گئی تھیں۔ آج

بھی اتفاق سے حارث کے آفس کا آف تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر آفس کا کوئی کام نمٹانے میں مصروف تھا' جب دروازے کی بیل بجی۔ اماں شاید واش روم میں تھیں۔ حارث گیٹ کھولنے گیا تو گھبرائی بوکھلائی سی ہانیہ دروازے پر موجود تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک رکشے والا رکشے سے گردن باہر نکال کر اسی جانب متوجہ تھا۔

"حارث بھائی! میں ہینڈ بیگ میں پیسوں والا پرس ڈالنا بھول گئی' پلیز اسے کرایہ دے دیں۔" بے تحاشا شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے حارث کو مخاطب کیا۔

"عجیب بھلکڑ لڑکی ہے۔" وہ دل میں صرف سوچ ہی سکا۔ اگلے ہی پل اس کی بے چاری سی شکل دیکھ کر اسے ترس آگیا تھا۔

"تم چلو اندر۔ میں اسے کرایہ دیتا ہوں۔" حارث نے اسے نرمی سے مخاطب کیا اور رکشے والے کو کرایہ دے کر جب وہ لاؤنج میں سے گزرا تو صوفے پر بیٹھی ہانیہ پر نگاہ پڑی۔

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے سر جھکا کر جانے کس سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ اسے حارث کی آمد کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ حارث اپنے کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس لڑکی کو اس کی ماں اس کا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھیں اور حارث کے انکار پر وہ یہ خواہش دوبارہ زبان پر نہ لائی تھیں' مگر ان کی خاموش سی خفگی بھی حارث سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔

"کیا اماں کی خواہش پوری کرنے کو وہ ہانیہ سے شادی پر راضی ہو سکتا ہے۔" اس نے ہانیہ پر اک نگاہ ڈالتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔

وہ خوب صورتی کے موجہ پیمانے پر پوری اترتی تھی۔ دودھ ملائی سی رنگت' ستواں ناک' قدرتی گلابی ہونٹ' متناسب سراپا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا' لیکن اس کی غیر متوازن شخصیت' بلا کی زود رنج' بھلکڑ اتنی کہ بنا پیسوں کے گھر سے نکل پڑی' غیر حاضر دماغی کا یہ عالم کہ حارث اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا اس کا چہرہ تک رہا تھا اور ہانیہ کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ جانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی وہ۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں ہانیہ!" حارث نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جیسے ایک دم چونکی تھی۔

"جی حارث بھائی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"تمہاری پڑھائی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ کیسی جارہی ہیں تمہاری اسٹڈیز۔" اس نے دوبارہ اپنا سوال دوہرایا تھا۔

"پڑھائی ٹھیک جارہی ہے حارث بھائی! خالہ کو بلادیں گھر پر ہی ہیں نا؟" عجلت میں اس کے سوال کا جواب دے کر اماں کے بارے میں پوچھا۔ حارث سخت بدمزا ہوا۔ مانا یہ لڑکی اس گھر میں صرف اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی' لیکن خالہ کے بیٹے نے اسے مخاطب کرنے کی غلطی کر ہی لی تھی تو ایک' دو باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا۔

"تم بیٹھو' میں اماں کو بھیجتا ہوں۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔ سامنے سے ہی اماں بھی آرہی تھیں۔ وہ انہیں ہانیہ کی آمد کا بتا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں اماں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ بنا کچھ کہے انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پر دھرا ٹشو کا ڈبا اٹھایا تھا۔

"اگلے مہینے کے سامان میں چار ڈبے فالتو منگوا لیجیے گا۔ آپ کی بھانجی گھر کے سارے ٹشو استعمال کر لیتی ہے۔" اس نے اماں کو مخاطب کیا' وہ کچھ نہ بولیں بس بیٹے پر تیکھی نگاہ ڈال کر ٹشو کا ڈبا لیے واپس پلٹ گئی تھیں۔

"جانے آج کیا ستم ٹوٹا ہے محترمہ کی ذات پر۔" اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا تھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا' لیکن آج جانے کیوں کام پر توجہ مرتکز نہ ہو رہی تھی۔ طبیعت پر بھی عجیب کسل مندی سے طاری تھی۔ اماں تو اپنی

بھانجی کے پاس سے گھنٹہ بھر سے پہلے کیا ہی اٹھتیں، اس نے خود اپنے لیے چائے بنانے کی سوچی۔ لاؤنج میں اب اماں اور ہانیہ نہ تھیں۔ اماں شاید اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔

حارث نے اپنے لیے کیتلی میں چائے چڑھائی تو جانے کیسے اخلاقیات اور مہمان داری کا تقاضا یاد آگیا۔ اماں اور ان کی بھانجی کے لیے بھی چائے بنالی۔ خود ٹرے میں کپ سجا کر لے جانا تو اسے اچھا نہ لگا۔ اپنے مگ میں چائے ڈال کر وہ اماں کے کمرے کی طرف گیا۔ سوچا تھا انہیں کہہ دے کہ چائے بنی ہوئی ہے۔ کچن میں سے جا کر لے لیں، مگر اماں کو باآواز بلند پکارنے سے پہلے ہی وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔ کمرے میں سے موصوفہ کی زور زور سے رونے کی آواز آرہی تھی اور اماں اسے چپ کروانے کی کوشش میں ناکام ہوئے جارہی تھیں۔

"حد ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بھی بلاوجہ اماں کو پریشان کرتی ہے۔ کوئی معمولی سی بات ہوگی اور یوں رونا دھونا ڈال رکھا ہے۔" حارث کو ازحد کوفت ہوئی۔

"ہانیہ میری بچی! بتا تو سہی ہوا کیا ہے۔ کب سے روئے جارہی ہے۔ پہلے تو کبھی اتنا نہیں روئی۔ ہلکان کرلیا ہے خود کو، مجھے بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟" اماں کی آواز نے حارث کو وہیں کھڑے رہنے پر مجبور کردیا۔ فطری تجسس آڑے آیا کہ محترمہ کیا جواب دیتی ہیں۔

"نازو بھابھی نے میرے لیے اپنے بھائی کا رشتہ دیا ہے خالہ!" بے تحاشا روتے ہوئے اس نے آخر بتا ہی ڈالا۔

"تو میری چندا! اس میں یوں رونے کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں بچیوں کے رشتے آتے ہی ہیں۔"

اماں نے اسے پچکارا تھا۔ حارث کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ جو لڑکی رشتہ آنے پر ایسا واویلا مچارہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کے کیا ہی کہنے۔ اور اماں ان محترمہ کو اس کے پلے باندھنا چاہ رہی تھیں۔

"آپ کو نہیں پتا خالہ! نازو بھابھی کا بھائی ایک نمبر کا لوفر اور آوارہ ہے۔ ویسے تو اس نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ جاب بھی اچھی ہے، لیکن وہ بہت ہی لوز کریکٹر بندہ ہے اور نازو بھابھی کو اپنے لفنگے بھائی کے لیے میں نظر آگئی۔ ان کے خاندان میں کوئی اس شخص کو لڑکی دینے کو تیار نہیں اور میرے بھائی آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو تیار ہیں۔" وہ ہچکیوں سے رورہی تھی۔

"تجھے کس نے بتایا کہ وہ ایسا لڑکا ہے۔" اماں نے تحمل اور رسانیت سے دریافت کیا۔

"شہلا بھابھی اور چھوٹی بھابھی کی باتیں سنی تھیں۔ انہیں سب پتا ہے شہزاد کے متعلق۔ پتا تو توفیق بھائی کو بھی ہے، ظاہر ہے وہ ان کا سگا سالا ہے، لیکن ان کے منہ میں تو نازو بھابھی کی زبان ہے۔ افسوس مجھے شمس بھیا اور چھوٹے بھیا پر ہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شہزاد کس ٹائپ کا لڑکا ہے اور اس کی باتیں میں نے ان کی بیویوں کی زبانی ہی سنی ہیں تو پہلے تو دونوں بھابھیاں مکر گئیں، پھر چھوٹے بھیا بولے کہ شادی سے پہلے لڑکوں میں تھوڑی بہت ایسی ویسی عادتیں ہوتی ہی ہیں۔ شادی کے بعد سب سدھر جاتے ہیں۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ برسرروزگار بھی اور کیا گارنٹی ہے کہ کسی اور جگہ سے رشتہ آئے گا تو لڑکا بہت شریف اور سلجھا ہوگا۔ یہ تو نازو بھابھی کا بھائی ہے اس لیے اچھی بری عادتیں سامنے آگئیں اور شمس بھیا بولے کہ کیوں کہ نازو بھابھی ہمارے گھر کی بہو ہیں تو شہزاد کے گھر میری پوزیشن مستحکم ہوگی۔ وہ لوگ ہمارے دباؤ میں رہیں گے۔ آپ خود بتائیں خالہ کیا یہ معقول وجہ ہے میرا وہاں پر رشتہ کرنے کی اور نازو بھابھی جیسی خاتون بھی کسی کے دباؤ میں آسکتی ہیں۔ جیسی وہ ہیں ویسا ہی ان کا خاندان ہے۔ میں تو ان کے گھر میں جاکر جیتے جی مرجاؤں گی اور پھر وہ لفنگا شہزاد.... اف! میں مرجاؤں گی خالہ! مگر اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

رو رو کر ہانیہ کا گلا بیٹھ گیا تھا اور کمرے سے باہر کھڑے حارث کو اب اس کی باتیں اور رونا بچکانہ نہ لگ رہا تھا۔ جب کسی کی زندگی داؤ پر لگی ہو تو واویلا مچانا حق ہے۔ اس وقت اپنی کزن پر اسے ترس بھی آرہا تھا

اور دلی ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم ایک بار توفیق سے بات تو کرو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ تمہارے باپ کی جگہ پر ہے۔ تمہاری بات کیوں نہ سنے گا۔ وہ کبھی تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری زندگی کا فیصلہ نہیں کرے گا۔" اماں بہت خوش فہم تھیں یا پھر انہیں بھانجے کی فطرت کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ہانیہ انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"چلو شاباش۔ یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ یہ پانی پیو۔" اماں غالباً اسے پانی کا گلاس تھما رہی تھیں۔

"پرسوں شہزاد ہمارے گھر آیا تھا خالہ!" ہانیہ نے رندھی ہوئی آواز میں مزید کچھ بتانا چاہا۔

"اس کی بہن کا گھر ہے۔ آگیا ہوگا پھر کیا ہوا۔" اماں نے اس کی پوری بات سنی ہی نہ تھی۔

"ٹھیک ہے خالہ! اس کی بہن کا گھر ہے اور وہ پہلی بار نہیں آیا' آتا رہتا ہے اور میں ہر بار کوشش کرتی ہوں کہ اس کا سامنا نہ کروں۔ مجھے اس کی گندی نگاہوں سے اتنی الجھن ہوتی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ پرسوں بھی میں اس کی شکل دیکھتے ہی کچن میں گھس گئی اور پتا ہے خالہ! تھوڑی دیر بعد وہ میرے پیچھے کچن میں ہی چلا آیا۔" وہ بتاتے بتاتے پھر بری طرح رو پڑی۔

"میں اسے اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں۔ کہنے لگا۔ تمہارا ساتھ چاہیے۔ میرا دماغ گھوم گیا خالہ! میں نے اس سے کہا کہ وہ شرافت سے باہر جا کر بیٹھے' ورنہ میں آواز دے کر بھائی کو بلا لوں گی۔ وہ زور سے ہنسا' پھر میری لٹ پکڑ کر کھینچی' کہنے لگا جانتا ہوں تم اڑی دکھا رہی ہو' لیکن یاد رکھو جتنا مرضی انکار کر دو دلہن بن کر میرے ہی گھر آنا ہے پھر گن گن کر بدلے لوں گا' پھر وہ چلا گیا خالہ! مجھے لگا کہ میرے ماں باپ آج ہی مرے ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی گلی یا بازار میں کھڑی ہوں۔ بے سائبانی کا جو احساس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا' میں چاہوں بھی تو آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

وہ بلک بلک کر روئی تھی اور کمرے سے باہر کھڑے حارث کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اشتعال کی شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس لڑکی کا رونا دھونا اسے ہمیشہ بچکانہ لگتا تھا۔ اس کے آنسو آج برداشت سے باہر تھے۔ وہ اس کی سگی خالہ زاد تھی۔ کسی شخص کی یہ جرات کیسے ہوئی کہ وہ اسے اس کے گھر جا کر ہراساں کر آئے۔

حارث کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس شہزاد کا جا کر منہ توڑ دے۔ وہ بھول گیا کہ وہ اماں کے کمرے کے باہر کیوں کھڑا ہے۔ وہ اماں کو کیا کہنے آیا تھا۔ اماں کو پکارے بغیر واپس پلٹ گیا۔

پتا نہیں ہانیہ کی واپسی کب ہوئی تھی۔ بہت دیر بعد اماں اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں۔ ہانیہ جا چکی تھی۔ کھانے کے دوران وہ منتظر رہا کہ اماں ہانیہ کے متعلق کوئی بات کریں گی۔ اس کے نگوڑ مارے بھائیوں اور کم بخت ماری بھابھیوں پر ضرور لعنت ملامت کریں گی' لیکن خلاف معمول اماں آج ہانیہ کے بارے میں ایک لفظ نہ بولی تھیں' لیکن ان کے چہرے پر چھایا اضطراب اور پریشانی حارث کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ پائی۔

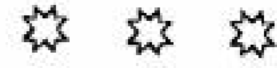
"کیا بات ہے اماں! آپ' کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟" اس نے ماں کو کریدا۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولیں' بس ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بیٹے پر شکوہ کناں سی نگاہ ڈالی۔

"اتنی ناراضی سے کیوں دیکھ رہی ہیں' کچھ تو بولیں۔" وہ جانے ماں کے لبوں سے کیا سننے کا متمنی تھا۔

"بولوں تو تب نا' میرے بولنے کا کچھ فائدہ ہو۔ کھانا کھاؤ بیٹا! کوئی بات نہیں ہے۔ نہیں ہوں میں پریشان۔" اماں دھیرے سے بولی تھیں۔

حارث چپ چاپ ماں کو تکنے لگا۔ شدید شرمندگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اماں اس کی ہٹ دھرمی سے واقف تھیں اسی لیے نہ صرف اپنی خواہش سے دست بردار ہو گئی تھیں' بلکہ اب اسے

ہانیہ کے حالات بتانے سے بھی اسی لیے گریزاں تھیں کہ ان کی نگاہ میں یہ بے کار تھا۔



دو دن اور دو راتیں اس نے مسلسل سوچا تھا۔ ہانیہ کو سوچتا تو ترس اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات دل میں ابھرتے۔ اماں کی حکم عدولی اور اپنی ہٹ دھرمی یاد آتی تو شرمندگی کا احساس بیدار ہوتا۔ یہ طے تھا کہ اماں کا دل دکھا کر وہ خود بھی کبھی مطمئن اور خوش نہ رہ سکتا تھا۔ گزرے بہت سے دن اس حقیقت کا بین ثبوت تھے۔

ہانیہ اماں کا انتخاب تھی۔ اس کی شخصیت کچھ ناپختہ تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انسان میں بردباری اور سمجھ داری آہی جاتی ہے۔ جو کام کوئی اس سے زور زبردستی سے نہ کروا سکتا تھا۔ وہ بس خود بخود ہی ہوگیا۔ ہانیہ کے لیے دل قائل ہوگیا اور اس فیصلے پر دماغ مطمئن ہوگیا۔ اب اماں کو خوش کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

چھٹی والے دن افشاں آپا اور عینی آپا آئیں تو اس نے بہت معصوم سے انداز میں ماں بہنوں کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ لوگوں نے ایک بار میری شادی کا ذکر کیا اور پھر یہ تذکرہ ہی بھول گئے۔ جانتے ہیں نا، میں کتنا شرمیلا ہوں۔ اس دن سے انتظار کر رہا ہوں کہ دوبارہ یہ ذکر چھیڑیں تو میں اپنی پسند بتاؤں۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔" عینی آپا کا صدمے سے برا حال تھا۔ شریف اور معصوم سا بھائی خود ہی کسی لڑکی کو پسند کرلے گا کم از کم یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

"تم اپنی پسند بتاؤ۔ ہم رشتہ لے جائیں گے۔" اماں نے پرسکون اور ہموار لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

"جی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جلد از جلد وہاں رشتہ لے جائیں کیوں کہ اس لڑکی کا ایک پروپوزل آیا ہوا ہے، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے گھر والے کسی اور کو ہاں کردیں۔"

"تمہارے آفس میں کام کرتی ہے نا؟" افشاں آپا نے یقین بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"کب سے پسند کرتے ہو اسے اور اتنے دنوں سے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی؟" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عینی آپا نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"یہ سب سوال بے معنی ہیں۔ تم مجھے اس لڑکی کا نام پتا بتاؤ، میں کل ہی رشتہ لے جاؤں گی۔" اماں کا وہی ٹھنڈا ٹھار انداز تھا۔ حارث نے محبت سے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

"لڑکی کا نام پتا بتاؤں گا تو مجھے دو جوتے تو نہیں لگائیں گی۔" اماں جواب میں کچھ نہ بولی تھیں، بس حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔

"حیران مت ہوں اور کوئی غلط گمان بھی دل میں نہ لائیں۔ کسی ایسی ویسی لڑکی کے گھر نہیں بھیجوں گا آپ لوگوں کو، لڑکی بہت بھولی بھالی ہے، سیدھی سادی اور معصوم بھی۔ بس اسے بات بات پر رونا..."

"نہیں تجھے واقعی دو جوتے لگاؤں گی حارث! سیدھی طرح لڑکی کا نام بتا۔" اماں نے اسے گھورا تھا۔

"آپ سب کی پیاری ہانیہ اور کون۔" وہ مسکرایا۔

"اگر ہانیہ قبول ہے تو اس ڈرامے بازی کی کیا ضرورت تھی؟" افشاں آپا نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کے شانے پر زوردار دھپ رسید کیا۔ وہ محض سر کھجا کر مسکرا دیا تھا۔

"اور تجھے کس نے بتایا کہ ہانیہ کا کوئی اور رشتہ آیا ہوا ہے؟" اماں کو اچانک اس کی ذرا دیر پہلے کی گئی بات یاد آئی۔

"کہیں تم نے اس روز ہانیہ کی باتیں تو نہیں سن لیں۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اماں نے ایک اور سوال داغا۔

"ہاں، لیکن ایسا غیر ارادی طور پر ہوا۔ میں تو آپ دونوں سے چائے کا پوچھنے گیا تھا۔" حارث نے جھٹ وضاحت دی۔ اماں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں حارث کہ تو ہانیہ پر ترس کھا کر اس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔" اماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اُفوہ اماں! اب آپ بال کی کھال تو مت اتاریں۔ آپ کی تسلی کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ فیصلہ میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ کیا ہے۔" اس نے ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں یقین دلایا تھا۔ اماں کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ انہوں نے بے ساختہ بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

"اللہ تجھے سدا خوش رکھے میرے بچے۔"

"آمین' آمین۔ اب باقی باتیں بعد پر اٹھا رکھیں اور چلیں ہانیہ کے گھر۔" نینی آپا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا۔ آج ہم دونوں بہنیں اتفاق سے اکٹھی آئی ہیں تو بس پھر چلتے ہیں ہانیہ کے گھر۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ چلیں اماں اٹھیں۔" افشاں آپا بھی بہن کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بہنوں کی اس درجہ عجلت پر حارث کو ہنسی آ گئی۔

"ہنس لینا بعد میں۔ پہلے مٹھائی کا ڈبا اور کچھ پھل لا دو۔ خالی ہاتھ رشتہ مانگنے تھوڑی جائیں گے۔" اماں کی خوشی کا عجب ہی عالم تھا۔

"جو حکم جناب کا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ گیا۔

اور پھر سارے مرحلے گویا پلک جھپکتے میں طے ہوئے۔ ہانیہ کے بھائیوں نے خالہ زاد بھائی کو شرف قبولیت بخش دی تھی۔ شروع میں توفیق بھائی نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ یہ یقیناً" نازو بھابھی کی آنکھوں کے اشارے پر کر رہے تھے' لیکن اماں نے بنا کسی لحاظ کے ان کی طبیعت صاف کر دی۔

"تم بار بار اپنے سالے کے رشتے کا جو حوالہ دے رہے ہو' ذرا بتاؤ۔ وہ میرے حارث کے پاسنگ بھی ہے۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے چار جگہ تو اس کی منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ کچھ تو خوف خدا کرو توفیق! بڑا بھائی تو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے۔ صرف اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر جانتے بوجھتے ہانیہ کے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو اور میں یہ سب کچھ حارث کی ماں ہونے کے ناتے نہیں کہہ رہی۔ بھلے سے تم ہمیں ہانیہ کا رشتہ نہ دو' لیکن میں شہزاد سے بھی ہانیہ کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ ہانیہ کی ماں زندہ نہیں تو کیا ہوا' اس کی خالہ ابھی زندہ ہے' میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔"

اماں کا جذباتی پن عروج پر تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ خالہ جان! ہمیں ہانیہ کے لیے حارث سے اچھا لڑکا اور کہاں سے ملے گا۔ جب تک کوئی اور رشتہ نہیں تھا ہم شہزاد کے پروپوزل پر غور کر رہے تھے' لیکن کوئی حتمی فیصلہ تو نہیں کیا تھا نا۔ آپ بالکل مناسب وقت پر آ گئیں۔ ہمیں یہ رشتہ بخوشی قبول ہے۔"

ہانیہ کے چھوٹے بھیا نے انہیں مخاطب کیا تھا۔ شمس بھیا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ توفیق بھی کچھ شرمندہ سے نظر آئے اور جب نازو بھابھی نے تیکھے تیوروں سے "لیکن" کہہ کر کچھ بات کرنے کی کوشش کی تو انہیں چپ کروانے کا فریضہ ان کے میاں نے ہی انجام دیا۔

"تم خاموش رہو نازو! جب ہم تینوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارے بولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" اور نازو بھابھی واقعی ایک منٹ میں خاموش ہو گئیں۔

"اگلے مہینے ہانیہ کے فائنل پیپرز ہیں خالہ! اس کے بعد آپ لوگ کوئی بھی مناسب تاریخ رکھ کر اسے رخصت کروا کر لے جائیں۔"

توفیق کے الفاظ سے اماں پر شادی مرگ طاری ہو گئی تھی اور ٹھیک دو ماہ بیس دن بعد وہ ہانیہ کو حارث کے سنگ رخصت کروا کر لے آئی تھیں۔



ہانیہ کا گھبرایا' بوکھلایا سا روپ حارث کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے ساتھ آج اس کا شرمایا' شرمایا سا روپ اتنا انوکھا اور دلکش لگ رہا



English
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہوجائیں!
English
ANTI - LICE
SHAMPOO
English
ANTI - LICE
SHAMPOO
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
facebook.com/snscares

تھا کہ حارث کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ شاید وہ مشہور زمانہ محبت جو نکاح کے دو بولوں کے ساتھ مشروط ہوتی ہے' وہ اس کے دل میں بھی جنم لے چکی تھی۔ لیکن فی الوقت وہ محبت اور وارفتگی کا اظہار کر کے ہانیہ کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

حارث چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان اپنائیت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو۔ وہ ہانیہ کی غیر ضروری جھجک اور بوکھلاہٹ ختم کرنا چاہتا تھا اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے دوستانہ رویے سے ہانیہ کی جھجک میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی' بلکہ شادی کے بعد ایک دن ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔

"مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ آپ اتنے فرینڈلی اور ہنس مکھ ہوں گے۔ پہلے تو آپ مجھے بہت خشک مزاج اور سنجیدہ ٹائپ بندے لگتے تھے' لیکن آپ تو بہت سوفٹ نیچر کے مالک ہیں۔"

"مجھے بھی ہرگز اندازہ نہ تھا کہ تم مسکرا کر بات کرتے ہوئے اتنی پیاری اور من موہنی لگو گی۔ پہلے تو ہمیشہ تمہیں رونے پر کمربستہ دیکھا تھا۔" حارث اسے دیکھ کر مسکرایا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی اس ذرا سی بات پر ہی بری طرح شرما گئی تھی۔

"اچھا مجھے، بتادیں کہ کل آفس کے لیے آپ کے کون سے کپڑے پریس کروں' پھر شام کے کھانے کی تیاری کروں گی۔" حارث کی جذبے لٹاتی نگاہوں کے سامنے بیٹھنا ہانیہ کے لیے آسان نہ تھا۔ اس نے جھٹ موضوع بدلا تھا۔

حارث مسکراتے ہوئے اٹھا اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگا۔ ہانیہ ایک ذمہ دار بیوی اور بہو بننے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ حارث کو اس کی ایسی کوششوں پر ہنسی بھی آتی اور پیار بھی۔

گھریلو کام کاج میں وہ خاصی اناڑی تھی۔ بھابھیاں اس سے اوپر نیچے کے تو درجنوں کام کروالیتی تھیں۔ لیکن کریڈٹ لینے والے ذمہ داری کے کام کبھی اس کے سپرد نہ کرتیں اور کوکنگ تو اس سے کبھی نہ کروائی تھیں۔ اب شادی کے بعد اماں اسے دھیرے دھیرے گھر کے کام سکھا رہی تھیں۔ وہ بہت دل جمعی اور شوق سے اماں کے ساتھ کچن کے کاموں میں حصہ لیتی تھی۔

آج اماں کسی رشتہ دار کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ پہلی بار کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری صرف اور صرف ہانیہ کے کندھوں پر تھی۔

"بتائیں نا حارث! کیا بناؤں کھانے میں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔" مسئلہ اتنا بڑا نہ تھا لیکن وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔

"اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔ دو تین پیاز کاٹو۔ اس میں دو تین انڈے پھینٹ لو اور مزیدار سا آملیٹ بنالو۔ روٹی میں بازار سے لے آؤں گا۔" حارث نے مسئلے کا فوری حل نکالا تھا۔

"آپ سے تو مشورہ مانگنا بھی فضول ہے۔" وہ ذرا خفا ہوئی اور حارث کو اس کا یہ خفگی بھرا انداز بھی بہت بھلا لگا تھا۔

"کیا کہیں گی خالہ جان پہلی بار مجھ اکیلی کو کچھ بنانا پڑا' تو آملیٹ بنا کر کام چلالیا۔ کوئی ڈھنگ کی چیز بتائیں حارث!" وہ اپنے مسئلے میں ہی الجھی ہوئی تھی۔

"اچھا یہ بات ہے۔" حارث کو جیسے بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔

"پھر یوں کرو چکن بریانی بنالو۔ چکن فریزر میں ہوگا ورنہ بتاؤ میں مارکیٹ سے لادیتا ہوں۔"

"چکن بریانی۔" ہانیہ نے تھوک نگلا۔ ہانیہ جیسی نو آموز کک کو بریانی کا نام سنتے ہی پسینہ آگیا تھا۔

"پیکٹ والی بنالو یار! ترکیب اس پر لکھی ہوگی۔" حارث اس کی شکل دیکھ کر مسئلہ پا گیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے' بنالوں گی۔ ایسی مشکل بھی نہیں۔" اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ حارث نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی اور پھر اس نے واقعی چکن بریانی بنالی تھی۔ اماں جب گھر آئیں تو کھانا بالکل تیار تھا۔

"خوشبو بتا رہی ہے کہ بریانی بنی ہے چلو بیٹا! جلدی

سے دسترخوان لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔" اماں نے چادر اتار کر تہ کی۔

"جی خالہ جان! میں بس دسترخوان لگا ہی رہی ہوں۔" ہانیہ نے مستعدی سے جواب دیا تھا اور بہترین خوشبو والی بریانی جب دسترخوان پر رکھی گئی تو اماں اور حارث نے پہلی نگاہ بریانی پر ڈالی اور دوسری ہانیہ کے چہرے پر۔

"چاول کھلے کھلے نہیں رہے۔" ڈش میں نکالے گئے چاول واقعی آپس میں گتھم گتھا لگ رہے تھے۔ یہ بریانی سے زیادہ کھچڑی لگ رہی تھی۔ ہانیہ نے ڈھیرے سے بریانی کی پہلی برائی خود ہی گنوادی۔

"کھلے کھلے نہیں ہیں تو کوئی خاص مرجھائے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ اور ذائقہ تو زبردست ہے۔" حارث نے پہلا نوالہ لے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی تھی' اور اتنی سی بات سن کر ہی ہانیہ کے چہرے پر رونق آگئی۔

"تعریف میں مبالغے سے کام مت لو حارث! ورنہ ہانیہ کی کوکنگ میں مزید بہتری نہیں آئے گی۔" اماں بیٹے کو ٹوکے بنا نہ رہ پائیں۔ حارث کو ہرگز اندازہ نہ تھا' کہ اماں اچانک یوں بول پڑیں گی۔ وہ واقعی چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

"بریانی کی خوشبو واقعی اچھی ہے بیٹا! لیکن اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ کمال پیکٹ کے مسالے کا ہے۔ چاول بوائل کرتے وقت تمہیں معمولی سی کسر رکھنی چاہیے تھی۔ وہ کسر دم لگنے کے وقت برابر ہو جاتی۔ تم نے چاول زیادہ ابال لیے' اس لیے تہہ لگانے کے بعد دم پر چاول گھل کر ٹوٹ گئے۔ پہلی بار بنائی ہے' ایسا ہو جاتا ہے۔ اگلی بار اس چیز کا دھیان رکھنا۔" اماں نے اسے نرمی سے ہی مخاطب کیا تھا' لیکن وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

"آئندہ خیال رکھوں گی خالہ جان!" اس نے مرے مرے لہجے میں یقین دلایا۔ حارث بغور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کی حساس طبیعت بیوی اس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔

"اچھا اماں! یہ بتائیں نسرین باجی کے شوہر کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اسپتال سے ڈسچارج کیا انہیں۔" اس نے گفتگو کا موضوع بدلا تھا۔ اماں مریض کی طبیعت کا احوال دینے لگیں۔ ہانیہ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر خود پر قابو پایا اور جس وقت وہ برتن سمیٹ کر کچن میں گئی تو حارث ماں کو جتائے بغیر نہ رہ پایا۔

"کیا تھا جو آپ دو بول تعریف کے بول دیتیں۔ اتنا چھوٹا سا تو دل ہے اس کا۔" اماں نے بغور بیٹے کو دیکھا' پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ میری بھانجی ہے۔ ماں اس کے بچپن میں ہی رخصت ہو گئی۔ اب اسے طریقہ' سلیقہ سکھانا میری ذمہ داری ہے۔ ویسے اپنی بھانجی کی حمایت میں تمہارا بولنا مجھے اچھا لگا ہے۔" اماں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

"آپ کی بھانجی اتفاق سے میری بیوی بھی ہے۔" ماں کے انداز پر اسے ہنسی آ گئی تھی۔ اماں بھی محظوظ انداز میں مسکرا دیں۔

اماں واقعی اپنی بھانجی کو جی جان سے چاہتی تھیں۔ لیکن اسے طریقہ سلیقہ سکھانے کی کوشش میں معمولی سا سمجھوتا بھی نہ کرتی تھیں۔ جہاں غلطی ہوتی' برملا ٹوک دیتیں۔ ایسے میں حارث بغور ہانیہ کے تاثرات دیکھتا۔ خجالت اور خفت سے اس کا برا حال ہو رہا ہوتا۔ حارث کو لگتا کہ وہ اب روئی کہ تب' لیکن بہت جتن کر کے وہ اپنے آنسو کنٹرول کر ہی لیتی۔ اپنی حساس طبیعت بیوی کے یہ بن روئے آنسو حارث کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوتے۔

وہ جانتا تھا کہ شادی سے پہلے ہانیہ اماں کے پاس محض اس لیے آتی تھی کہ اپنے گھر والوں کے خلاف جو چھوٹے چھوٹے شکوے شکایت اس کے دل میں جمع ہوتے' وہ انہیں اماں کو سنا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔ شادی کے بعد رونے کے لیے اسے اماں کا کندھا

میسر نہ تھا کیونکہ اکثر و بیشتر اسے اماں کی باتوں پر ہی رونا آتا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی حارث سے اس بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے دل کا حال بتا جاتے۔

"تھوڑی سی تو رعایت دے دیا کریں۔ آخر بھانجی ہے آپ کی۔ آہستہ آہستہ سارے کام سیکھ ہی جائے گی۔"

اس روز بھی جانے ہانیہ سے کیا گڑبڑ ہوئی تھی کہ اماں نے اسے پورے آدھے گھنٹے کا لیکچر دے ڈالا۔ وہ جی خالہ، جی خالہ کرتی رہی تھی اور جب وہ منظر سے ہٹی تو حارث نے اماں سے "ہاتھ ہولا" رکھنے کی استدعا کی تھی۔

"آہستہ آہستہ نہیں۔ ماشاء اللہ ہانیہ نے گھر کے کام بہت جلدی سیکھ لیے ہیں۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی۔ میں ہوں نا اس کی رہنمائی کے لیے۔" اماں نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

کوئی اور ماں ہوتی تو بیوی کی حمایت پر بیٹے اور بہو سے بدظن ہو جاتی لیکن اماں کو تو حارث کی باتیں سن کر خوب ہی لطف آیا تھا۔ اگلے روز عینی آپا آئیں تو انہیں بھی مسکرا مسکرا کر حارث کی باتیں بتائی تھیں۔

"کہاں، شادی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ کہتا تھا، روتی بسورتی لڑکی کو آپ میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہیں اور اب ایسی کایا پلٹی ہے صاحبزادے کی کہ ہانیہ کو کچھ سمجھانے بھی لگوں تو اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

اماں بھانجی کے لیے بیٹے کی محبت دیکھ کر نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ حارث ہانیہ کے سنگ خوش تھا۔ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اپنے انتخاب پر اماں مطمئن اور مسرور تھیں۔ یہ خوشی اس وقت بھی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

"تو میں آپ سے یہ ہی تو کہتی تھی کہ ایک بار ہانیہ کو گھر آ لینے دیں۔ اس کا جادو آپ کے بیٹے کے سر چڑھ کر بولے گا۔ آپ کو خواہ مخواہ خدشے ستاتے تھے کہ حارث صرف آپ کی ناراضی کے خوف سے اس رشتے پر راضی ہوا ہے۔ کبھی کہتی تھیں، ہانیہ پر ترس کھا کر رضامندی دی ہے۔ جانے شادی کے بعد خوش رہ پائے گا یا نہیں۔ میں اور انشاں دونوں ہی آپ کو سمجھاتے تھے کہ سارے خدشے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ ہانیہ ماشاء اللہ ایسی پیاری اور من موہنی لڑکی ہے کہ حارث کے دل پر راج کرے گی اور دیکھ لیں، کتنی جلدی ہماری پیش گوئی پوری ہوئی۔" عینی آپا مسکراتے ہوئے اماں سے مخاطب تھیں۔

"ہاں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میرا انتخاب درست ثابت ہوا۔ میری ہانیہ کے آنے سے تو گھر میں اجالا سا بکھر گیا ہے۔" اماں کے لہجے میں ہانیہ کے لیے بے تحاشا پیار امڈ آیا تھا۔

"ایک منٹ اماں! کیا خیال ہے میں ہانیہ کو بھی بلا لوں۔ محبت کے غائبانہ اظہار کے بجائے یہ تعریفیں اس کے منہ پر کر ڈالیں۔ خوش ہو جائے گی وہ بھی۔" حارث نے مسکرا کر اماں کو مخاطب کیا۔

"یہ لڑکا تو باؤلوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ سمجھتا ہے، میں ہانیہ کے منہ پر اس کی تعریف نہیں کرتی۔" اماں اس بار تھوڑی سی خفا ہو گئی تھیں۔

"ہانیہ کی تعریف اماں کیوں کریں۔ اب یہ ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔" عینی آپا نے شرارت سے اس کا کان کھینچا تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ انہیں کیا بتاتا کہ وہ تو یہ ذمہ داری بخوشی نبھانے کو تیار تھا لیکن اس کی شادی تو چھوئی موئی کے پودے سے ہوئی تھی۔ جب ذرا سا رومانٹک ہونے لگتا زوجہ محترمہ پر شرم اور گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ وہ بلاشبہ چند ہی دنوں میں ہانیہ سے بے تحاشا محبت کرنے لگا تھا، لیکن محبت کی یہ شدت ہانیہ پر عیاں کرنے کے بجائے فی الحال تو وہ اس سے دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلق قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ حارث کی خواہش تھی کہ ہانیہ یہ حقیقت تسلیم کرے کہ حارث صرف اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ قابل اعتبار اور مخلص دوست بھی ہے۔ وہ ہر بات حارث سے بلاجھجک کہہ ڈالے لیکن شاید ہانیہ

ابھی اسے یہ رتبہ دینے پر تیار نہ تھی۔

وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ ہانیہ بہت چپ، چپ اور کھوئی کھوئی سی ہے۔ حارث جانتا تھا کہ اس گھر میں اسے کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں اکٹھی ہو کر اسے پریشان کر رہی تھیں اور اصل مسئلہ ہی یہ تھا کہ وہ یہ باتیں کسی سے نہ کہتی تھی۔

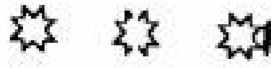
اماں گھر کے کاموں میں اس کی چھوٹی سی کی جانے والی غلطی نظرانداز کرنے پر تیار نہ تھیں۔ اس روز بھی ہانیہ دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ کر بھول گئی۔ بھول چوک انسان سے ہی ہوتی ہے مگر اماں نے اسے پندرہ منٹ کا لیکچر دے ڈالا تھا۔

"رزق کی قدر کرنی چاہیے بیٹا! کل تم گوشت کی ہانڈی چولہے پر رکھ کر بھول گئیں۔ آج سیر بھر دودھ ابال دیا۔ اور میں دیکھ رہی ہوں کہ آج کل تم کچھ الجھی، الجھی اور پریشان ہو کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ ہانیہ۔" ایک لمبے سے لیکچر کے اختتام پر اماں نے قدرے نرم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے خالہ جان!" ہانیہ نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو چھلکنے سے روکے تھے۔

حارث بس اسے دیکھ کر ہی رہ گیا۔ اس لمحے اسے کتنا ترس آیا تھا ہانیہ پر۔ سب کچھ کہہ سنا کر اماں اسے پوچھ رہی تھیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ کیا اماں کو اندازہ نہ تھا۔ کہ وہ کتنی زودرنج اور حساس ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کے لیے تو کوئی معمولی بہانہ ہی درکار ہوتا تھا اور یہاں اماں صبح شام کسی نہ کسی بات پر اسے لائن حاضر کیے رکھتیں۔ بے شک اماں کی نیت بری نہ تھی۔ وہ اسے مکمل گرہستن کے روپ میں دیکھنے کی متمنی تھیں، لیکن انہیں اپنی عزیز از جان بھانجی کی حساس طبیعت کو تو پیش نظر رکھنا چاہیے تھا۔ پر یہ بات اماں کو کون سمجھاتا۔

ہاں یہ بات ہانیہ کو سمجھائی جا سکتی تھی اور حارث یہی چاہ رہا تھا کہ کوئی مناسب موقع میسر آئے تو وہ ہانیہ کو بہت پیار اور رسانیت سے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ وہ ہانیہ کی دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ہانیہ اسے صرف اماں کا بیٹا نہ سمجھے بلکہ اپنا شوہر اور اپنا قابل اعتماد دوست بھی سمجھے۔ شادی کے بعد آنسو بہانے کے لیے اسے خالہ کا کندھا میسر نہیں تو کیا ہوا خالہ کا بیٹا تو ہے، جو اب اس کا شریک حیات ہے۔



اماں عینی آپا کے سسر کی عیادت کو گئی تھیں۔ انہوں نے حارث کو آفس فون کر کے گھر جلد آنے کی تاکید کی۔

اس نے جلد از جلد آفس کے کام نمٹائے تھے پھر باس سے چھٹی لے کر گھر کی راہ لی۔ ہانیہ کچن میں مصروف تھی۔ حسب توقع وہ حارث کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"آج آپ اتنی جلدی آ گئے۔ خیریت تو ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"اماں نے فون کر کے کہا تھا میری بہو گھر پر اکیلی بور ہو رہی ہے 'فوراً' اس کے پاس پہنچو۔ میں نے حکم کی فوری تعمیل کی اور دوڑا چلا آیا۔"

حارث نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ہانیہ بھی مسکرا دی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ حارث کو آج بھی وہ بہت بجھی بجھی اور پژمردہ لگی تھی۔

"تم جلدی جلدی اپنے کچن کے کام سمیٹو اور بیڈ روم میں آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

حارث اسے نرمی سے مخاطب کرتا کچن سے چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ چائے کا کپ لیے بیڈ روم میں آئی تھی۔

"یہ لیجیے چائے۔ بسکٹ ختم ہو گئے۔ آج خالی چائے پر گزارا کرنا پڑے گا۔" وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پھر جانے کے لیے مڑی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔ یہاں آؤ بیٹھو میرے پاس۔" حارث نے اسے پکارا تھا۔

"سنک برتنوں سے بھرا پڑا ہے حارث! برتن دھونے جارہی ہوں آپ کو کچھ اور چاہیے تو بتائیں۔ نمکو لادوں؟" اس نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"مجھے تمہارا کچھ وقت چاہیے۔ عنایت کردو گی۔" حارث اس بار قدرے خفا ہوا تھا۔ ہانیہ اس کے انداز پر حیران تو ہوئی تھی مگر خاموشی سے بیڈ کے سرے پر ٹک گئی۔ حارث چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"تم جانتی ہو' مجھ سے شادی کرنے کا تمہیں سب سے بڑا نقصان کیا ہوا ہے؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد حارث نے استفسار کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اس کے انداز پر حیران ہو رہی تھی یہ بات سن کر مزید حیران ہو گئی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں حارث؟" اس نے حیران نگاہیں حارث پر گاڑ کر پوچھا تھا۔

"شادی سے پہلے تم اپنا ہر دکھ سکھ یہاں اماں سے آکر کہہ دیا کرتی تھیں۔ شادی کے نتیجے میں بھانجی' خالہ کا رشتہ ختم ہو گیا اور ساس بہو کا رشتہ استوار ہو گیا۔ اور یہ اس شادی کا سب سے بڑا نقصان ہے۔" حارث نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں خالہ کی بھانجی نہیں رہی بلکہ ۔۔ بہو بن گئی۔"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں تمہیں بالکل دوش نہیں دے رہا۔ میرا کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہیں ایسا لگنے لگا ہے کہ اماں اب تمہاری خالہ نہیں بلکہ صرف ایک ساس بن کر رہ گئی ہیں۔" حارث نے وضاحت دی۔

"پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" ہانیہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"آج ان آنسوؤں کو بہنے سے مت روکو ہانیہ! اپنے جی کا سارا بوجھ میرے سامنے ہلکا کرلو۔ بنا جھجکے تم اپنی ہر فیلنگ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ بلیو می! میں اماں کو کچھ نہ بتاؤں گا۔" بات کے آخر میں وہ مسکرایا تھا۔

"خالہ کا یہاں کیا ذکر؟" ہانیہ کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

"خالہ کا ذکر کیے بنا جی کا بوجھ کیسے ہلکا ہو گا ڈیر وائف!" حارث اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل تک گیا تھا۔ ٹشو کا ڈبا اٹھا کر ہانیہ کے پاس رکھا اور پھر اس کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا۔

"میں مانتا ہوں ہانیہ! اماں تمہارے ساتھ اکثر زیادتی کر جاتی ہیں۔ تم گھر کے کاموں میں ابھی پوری طرح ایکسپرٹ نہیں ہوئیں۔ آہستہ آہستہ تم سب کاموں میں ماہر ہو جاؤ گی لیکن اماں فی الحال تمہاری معمولی سی غلطی بھی نظرانداز کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ تم یقیناً" ان کے اس رویے پر ڈس ہارٹ ہو جاتی ہو۔ میں بہت بار اماں کو سمجھا چکا ہوں' لیکن اماں تمہیں بہو سمجھتیں تو کچھ رعایت دیتی نا۔ وہ تو روز اول سے تمہیں بیٹی سمجھتی ہیں۔ وہ بیٹی' جس کی اپنی ماں اس کے بچپن میں اللہ کو پیاری ہو گئی اور اب اسے طریقہ' سلیقہ سکھانے کی ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر عائد ہو گئی۔ یقین کرو ہانیہ! اماں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں۔ وہ تمہاری پیٹھ پیچھے تمہاری بہت تعریفیں بھی کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تمہارے آنے سے گھر میں۔۔"

وہ بات کرتے کرتے رکا تھا۔ یک دم خیال آیا تھا کہ یہ وقت اماں کی صفائیاں پیش کرنے کا نہیں ہے۔ ان باتوں کے بعد تو شاید ہانیہ شرمندگی کے مارے اماں کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بول سکتی' جبکہ حارث چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل میں جمع چھوٹی سے چھوٹی شکایت' ہر طرح کے شکوے کا کھل کر اظہار کردے۔ یہ سمجھانے کا نہیں' سننے کا موقع تھا۔ واحد طریقہ' جس سے ہانیہ کے جی کا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے عینی آپا اور افشاں آپا جب بھی میکے آتی ہیں اماں کے سامنے اپنے سسرال والوں کی ڈھیروں ڈھیر برائیاں کر کے اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر کے واپس اپنے گھر کی راہ لیتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مسئلے ہر

گھر میں ہوتے ہیں ہانیہ! بدقسمتی سے تمہارے میکے میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے سامنے تم اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر سکو۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جمع ہو کر تمہارے اندر کی گھٹن کو بہت بڑھا دیں گی۔ میں چاہتا ہوں تم مجھ پر مکمل اعتبار کرو۔ بھول جاؤ میں اماں کا بیٹا ہوں۔ اماں سے یا عینی آپا وغیرہ سے جو بھی شکایت ہو، تم بلا جھجک مجھ سے ہر طرح کی بات کر سکتی ہو۔ ہاں آئندہ میں تمہاری آنکھوں میں گلابی ڈورے نہ دیکھوں۔ جانے چھپ چھپ کر کہاں روئی ہو اور کتنا روتی ہو۔ آئندہ صرف میرے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے ہیں۔ آئی سمجھ میں بات۔"

حارث نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اوپر کی۔ ہانیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ حارث نے بہت پیار سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"خالہ جان سے مجھے ہرگز کوئی شکایت نہیں۔ میں انہیں خالہ کہہ کر مخاطب تو کرتی ہوں لیکن میں انہیں اپنی ماں ہی سمجھتی ہوں۔ پتا نہیں آپ اتنی دیر سے مجھے کیا سمجھا رہے ہیں۔ میرے پلے ایک لفظ نہیں پڑا۔ اگر میں چھپ چھپ کر روتی ہوں تو اس کی وجہ خالہ جان نہیں، آپ ہیں حارث! صرف اور صرف آپ۔" وہ پھر بری طرح رو پڑی تھی۔

"میں؟" حارث کو تو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

"جب مجھے پسند نہیں کرتے تھے تو خالہ جان کے دباؤ میں آ کر شادی کی حامی کیوں بھری۔ کیوں جوڑا ایک ان چاہا رشتہ؟" وہ روتے روتے پوچھ رہی تھی۔

"تم سے کس نے کہا یہ سب؟" حارث سٹپٹا گیا تھا۔

"میں نے خود سنی تھیں اس روز آپ لوگوں کی باتیں۔ عینی آپا کہہ رہی تھیں کہ آپ نے محض خالہ جان کی ناراضی کے خوف سے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ خالہ جان اور عینی آپا خوش ہو رہے تھے کہ ان کا انتخاب درست ثابت ہوا اور آپ میرے سنگ خوش ہیں۔ جبکہ میں تو اس دن سے شاک کی حالت میں ہوں۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ کسی دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی پر راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ مجھے یہ بات بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔ آپ پہلے دن سے میرے ساتھ دوستانہ تعلق استوار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوستی دوستی کا راگ الاپتے رہے اور میں آپ کی محبت، وارفتگی اور التفات کو ترستی رہی۔ میں آپ کی بیوی تھی حارث! اور آپ مجھے کسی ناسمجھ اور کم عقل دوست کی طرح ٹریٹ کرتے رہے۔ میں خود کو مطمئن کرنے کے لیے لاکھ توجیہات دیں، لیکن پھر میری ساری خوش فہمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لیں۔ میں زبردستی آپ کی زندگی میں شامل کی گئی۔ یہ انکشاف مجھے کس اذیت میں مبتلا کر گیا، آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ میری نگاہوں میں میری ذات دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔ اس سے تو اچھا تھا میرے بھائی میری شادی شہزاد کے ساتھ...."

"اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔" حارث نے بے تحاشا خفا ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ وہ چپ تو ہو گئی مگر آنسو اب بھی مسلسل اس کے گال بھگو رہے تھے۔ حارث نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔ صورت حال اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلی تھی۔

"تم جس بے یقینی کی کیفیت میں ہو، پتا نہیں میری وضاحت کو قبول کرو گی بھی یا نہیں، لیکن اب تمہیں چپ ہو کر میری بات سننا ہو گی۔ فار گاڈ سیک آنسو بہانا بند کرو۔ یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔" حارث نے بے چارگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ جب اماں نے پہلی بار میرے سامنے تمہارا نام لیا تھا تو میں نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟" حارث نے پوچھا۔ ہانیہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے حارث کو دیکھا تھا مگر حارث کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

"میرے انکار کی وجہ تمہارے یہ ہی آنسو تھے مسز!" ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے حارث نے ٹشو کے ڈبے سے ٹشو نکال کر ہانیہ کو تھمائے تھے۔

"پچھلے کئی برسوں سے میں تمہارے ایک ہی روپ سے واقف تھا۔ اور وہ روپ یہ ہی رونے دھونے والا تھا۔ ایک روتی بسورتی لڑکی سے شادی کا میرا قطعاً" کوئی ارادہ نہ تھا۔"

"تو کسی نے گن پوائنٹ پر تو مجبور نہیں کیا تھا آپ کو۔ نہ کرتے مجھ سے شادی۔" اس بار ہانیہ تنک کر بولی تھی۔ حارث نے بہت مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

"مجھے کوئی گن پوائنٹ پر مجبور کر بھی نہیں کر سکتا مسز! میں ذرا وکھری ٹائپ بندہ ہوں۔" حارث نے اسے باور کروایا تھا۔ ہانیہ بس اسے خفگی سے دیکھتی رہ گئی۔

"جس طرح تم نے ہماری باتیں سن کر یہ کھڑاگ پھیلایا۔ اس طرح ایک دن میں نے بھی اتفاق سے تمہاری اور اماں کی باتیں سن لی تھیں۔ وہی دن تھا جب تم اماں کو شہزاد کے رشتے کے متعلق بتا رہی تھیں۔ اس روز تمہارے آنسو میری غیرت پر تازیانہ بن کر لگے۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں شہزاد کو شوٹ کردوں۔ اماں بھی تمہاری وجہ سے بہت اپ سیٹ تھیں، لیکن میرے ایک بار کے انکار کے بعد اماں نے دوبارہ میرے سامنے تمہارا نام تک نہ لیا تھا' جو کام مجھ سے کوئی زور زبردستی نہ کرواسکا' وہ بس خود بخود ہی ہوگیا۔ تم اسے ہمدردی کا نام دے لو یا فرماں برداری کا۔ بہرحال میں نے اماں کو تمہارے لیے ہاں کہہ دی تھی۔"

"مانتے ہیں نا آپ کہ یہ صرف ہمدردی پلس فرماں برداری تھی۔ مجبوری کا نہ سہی مگر یہ ہمدردی کا بندھن ہے نا۔" ہانیہ کی ہچکیاں پھر شروع ہوگئی تھیں۔

"ہاں نکاح سے پہلے تک یہ ہی صورت حال تھی۔" حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا۔

"اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ نکاح کے بعد آپ کو مجھ سے محبت بھی ہوگئی ہے۔" وہ روتے روتے بول اٹھی تھی۔ حارث لب بھینچ کر اسے خفگی سے تکتا رہا۔

"اب کیوں خاموش ہوگئے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

ہانیہ نے رندھی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"کیا کہوں' جو کہنے لگا تھا اس سے تم نے منع کردیا۔"

"مجھے بہلائیں مت حارث! اتنی بے وقوف اور کم عقل نہیں ہوں میں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"بے وقوف تو میں ہوں۔ شادی کے بعد سے اب تک اسی کوشش میں لگا رہا کہ ہمارے درمیان ایک دوستانہ سا تعلق استوار ہوجائے۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھ سے تمہاری جھجک ختم ہوجائے۔ اپنے دل کی ہر بات تم صرف میرے ساتھ شیئر کرو۔ میں سوچتا تھا' تمہاری زندگی میں پرخلوص رشتوں کی کمی رہی ہے۔ اپنے شوہر کو تم اپنا سب سے پرخلوص دوست مان لو۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تم سے ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کرسکا اور اظہار محبت کرتا بھی تو کیسے۔ ذرا سا رومانٹک ہونے لگتا تھا تو تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ میرے دل میں تمہارے لیے اتنی بے تحاشا محبت اچانک کیسے پیدا ہوگئی لیکن میں اپنی محبت اور وارفتگی ظاہر کرنے کے بجائے پہلے انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ بتاؤ ذرا! اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گھامڑ اور کون ہوگا۔ اور جس کے لیے یہ سب کچھ کیا' آج اسی کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑ گئی۔ اس معزز شخصیت سے میری التماس ہے کہ شک کی عینک اتار کر صرف ایک بار میری آنکھوں میں جھانک لے' اگر اسے واقعی ان آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر نہیں آرہا تو میں۔ ابھی اسی وقت اسے اچھے سے آئی اسپیشلسٹ کے پاس لے کر جانے لگا ہوں۔"

"آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں حارث!" کس بے یقین لہجے میں وہ استفسار کررہی تھی۔ حارث کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"کون سی زبان میں کہوں کہ تو تمہیں یقین آئے گا۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ہانیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔



انگلش
اُبٹن ٹرمیرک کریم
English
UBTAN TURMERIC CREAM
کیونکہ ... خوبصورتی حق ہے آپکا
SC-004-14
facebook.com/snscares

"ہاں بتاؤ! نظر آ گئی محبت یا واقعی چلیں کسی آئی کلینک پر؟" حارث نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اگر یہ اظہار پہلے کردیتے تو میں کیوں اتنے دن پریشان رہتی۔" ہانیہ کو محبت پر یقین آیا سو آیا' ساتھ ہی پھر سے رونا بھی آ گیا۔

"ذرا سی تعریف پر تو تم بیر بہوٹی بن جاتی تھیں۔ رومانس جھاڑنے لگتا تو جانے کیا حال ہوتا تمہارا۔"

حارث اسے شادی کے ابتدائی دن یاد دلا رہا تھا۔

"تو نئی نویلی دلہنوں کو شرم تو آتی ہی ہے نا' اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ شوہر ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کرپائے۔" حارث اس شکوے پر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

"میری دلہن اب بھی نئی نویلی ہی ہے۔ وہ مطمئن رہے اب اس کا شوہر اس سے محبت بھی کرے گا اور اظہار محبت بھی۔ کہو تو ایک غزل سنا کر اظہار محبت کی شروعات کروں؟" وہ شریر ہوا تھا۔

"بس کریں اب!" ہانیہ کے ہونٹوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"شروع کیا نہیں اور ابھی سے بس کردوں۔ پھر میرے خلاف ایک اور چارج شیٹ تیار ہوجائے گی۔"

وہ ہنسا تھا۔ ہانیہ بھی جھینپ کر ہنس پڑی۔

"چلو شکر ہے آج ہم دونوں کی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہوا۔ تم مجھ سے بدگمان تھیں اور میں سوچے بیٹھا تھا کہ شاید تم اماں کی باتوں پر ڈسٹرب رہتی ہو۔ میں سوچتا تھا جیسے تم اپنے گھر والوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل گرفتہ ہوجاتی تھیں' اماں کی باتیں بھی تمہیں ویسے ہی پریشان کرتی ہیں۔"

"آپ مجھے بہت امیچور سمجھتے تھے حارث! مجھے اپنے گھر والوں کی جن چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا آتا تھا' وہ بے شک آپ کے لیے معمولی ہوں لیکن مجھے ان کے جن رویوں کو مسلسل بھگتنا پڑ رہا تھا وہ سہنا کسی بھی نارمل انسان کے لیے آسان نہیں تھا۔ میری بھابیاں مجھے صرف ایک بوجھ تصور کرتی تھیں۔ ان کے سرد و سپاٹ رویوں کو سہتے سہتے جب میں تھکنے لگتی' تو یہاں خالہ کے پاس آکر اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرلیتی۔ ماں باپ کے بعد میرا گھر میرے لیے صرف ایک سرائے بن چکا تھا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں اور مہمانوں کی طرح رہنا کتنا تکلیف دہ امر ہے' اس کا اندازہ کوئی اور شخص لگا ہی نہیں سکتا۔" ہانیہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی۔

"چلو' اپنے تکلیف دہ ماضی کو بھول جاؤ۔ اللہ نے مجھ سا محبت کرنے والا شوہر عطا کرکے کیا تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ نہیں کردیا۔"

"آپ سے شادی کے بعد مجھے ماں جیسی خالہ کی شفقت بھری چھاؤں ہمیشہ کے لیے میسر آ گئی۔ میری اصل خوش نصیبی یہ ہے جناب!" ہانیہ نے اس بار مسکرا کر جتایا تھا۔

"تو جب ماں جیسی خالہ تمہارے کسی کام میں ماؤں کے انداز میں نقص نکالتی تھی تو تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگتے تھے؟" حارث کو بروقت یاد آیا تو پوچھ بیٹھا تھا۔

"صرف اور صرف آپ کی وجہ سے۔ خالہ جب بھی مجھے کچھ سمجھانے لگتیں۔ آپ مجھے ایسے ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتے کہ خفت کے مارے میرا برا حال ہوجاتا۔ میں سوچتی تھی کہ آپ اپنے دل میں مجھے پھوہڑ سمجھ رہے ہوں گے بس مجھے اسی لیے رونا آنے لگتا تھا۔"

"لو جی! یعنی کہ یہ قصور بھی میرے ہی کھاتے میں درج تھا۔" صدمے اور افسوس سے حارث کا برا حال ہونے لگا۔

"غلط فہمی تھی حارث! اب تو ختم ہوگئی نا۔" ہانیہ نے اسے تسلی دی۔ حارث اسے مصنوعی خفگی سے گھورنے لگا تھا۔

"اچھا اب ایسے ناراض ہو کر تو مت گھوریں۔ پرامس! آئندہ آپ کے خلاف کوئی غلط فہمی دل میں نہیں پالوں گی۔ جو بھی بات ہوگی سب سے پہلے آپ سے شیئر کروں گی۔ آخر آپ میرے بہترین دوست

بھی تو ہیں۔" ہانیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا تھا۔

"ہر گز نہیں۔ دوستی والی پیشکش محدود مدت کے لیے تھی۔ اب میں تمہارا شوہر ہوں۔ پہلے تم نے میرا دوستانہ روپ دیکھا تھا۔ اب میری محبتوں کی شدتیں بھی دیکھنی پڑیں گی اور اگر تم نے۔۔۔"

"میں سب کچھ دیکھ لوں گی حارث! پہلے ذرا کچن دیکھ لوں۔ اخیر دھلے برتنوں کا انبار جمع ہے اور شام کے کھانے کے لیے بھی کچھ بنانا ہے۔" ہانیہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اپنے پاس بٹھایا تھا۔

"تمہارا یہ شرمایا' بوکھلایا سا روپ میرے ہوش اڑا دیتا ہے' جان من! پتا نہیں چند ہی دنوں میں کیسا جادو کر دیا مجھ پر۔ ہر وقت ہر گھڑی صرف تمہارے خیالوں میں ہی کھویا رہتا ہوں۔" حارث کی مخمور لہجے میں کی جانے والی سرگوشی' اس کی وارفتگی' ہانیہ اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے میں ناکام ہوئے جا رہی تھی۔

"مجھے آپ کی محبت کی صداقت پر دل سے یقین آگیا ہے حارث! لیکن دوستی والی پیشکش کی مدت تھوڑے عرصے کے لیے اور بڑھا دیں پلیز۔"

وہ دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔ اس کی پلکوں کی لرزش اور گالوں پر بکھرتی لالی اس کی دلی کیفیت کا پتا دے رہی تھی۔ حارث محظوظ انداز میں مسکرایا تھا۔

"صرف ایک ڈائیلاگ سن کر یہ حالت ہوئی ہے۔ یہ تو اظہار محبت کی ابتدا ہے بیوی!" اس نے اسے شریر انداز میں چھیڑا۔

"آج کے لیے یہ ہی بہت ہے۔ بس میں اب کھانا بنانے جا رہی ہوں۔" وہ یک لخت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتی تیزی سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔

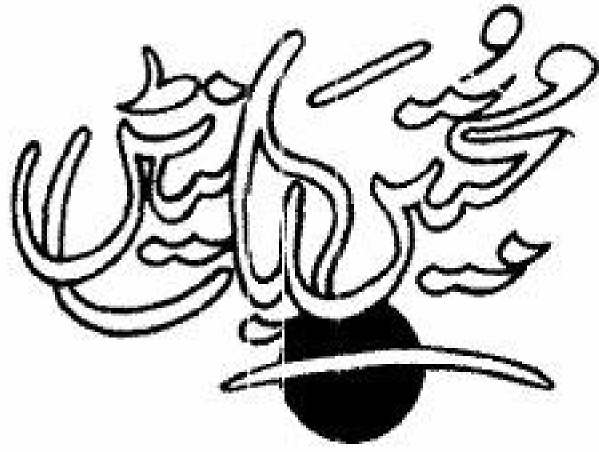
حارث کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ ماں کی فرماں برداری کا کیا خوب صورت اور حسین انعام ملا تھا اسے۔ اس کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

بہت مطمئن انداز میں وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

اب وہ آنکھیں موندے دل ہی دل میں رومانٹک سی غزل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا' جو آج شب اسے اپنی بیوی کو سنا کر باقاعدہ اور بھرپور اظہار محبت کرنا تھا۔ کیونکہ ہانیہ کا شکوہ بجا تھا۔ اظہار کے بنا محبت ادھوری تھی۔ اب اسے محبت بھی کرنی تھی اور ساتھ ہی اس کا بھرپور طریقے سے اظہار بھی۔ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کہ محبت کے بنا اس کی زندگی ادھوری تھی بالکل ادھوری کیونکہ محبت ہی تو زندگی ہے۔



فریدہ فرید



رازی نے، ریزن دیا تھا یا مذاق کیا تھا۔ ساتوں نفوس کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ربیعہ کو لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ ہالہ اور خولہ ایک دوسرے سے تصدیق کرنے لگیں۔ عباد اور نعمان کے قہقہے چھوٹ پڑے تو ثانی کی گھوری بڑی زوردار تھی۔ لوفریت میں نمبرون نادر نے سیٹیوں کا طوفان مچا دیا۔

یونیورسٹی فیلوز نے مل کر ویلنٹائن ڈے کے لیے اسپیشل پروگرام بنایا تھا۔ اور ثانی کے گھر میں اکٹھے ہو کر سلیبریٹ کرنے کا پروگرام پچھلے سات دن سے ان کے درمیان زیر بحث تھا۔ سب سے زیادہ ایکسائٹمنٹ اس دن کے حوالے سے وہ شرط تھی جس میں آٹھوں دوستوں نے مل کر طے کیا تھا کہ اس ویلنٹائن پر جس کو سب سے زیادہ سرخ گلاب، پھولوں کے گلدستے اور تحائف ملیں گے وہ ونر ہوگا۔

اس شرط کے حوالے سے عباد اور نادر نے اپنی درجن کے حساب سے موبائل فون گرل فرینڈز کو تیار کر رکھا تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک کا دعوا تھا کہ زیادہ تحفے وہ حاصل کرے گا۔ دوسری طرف نعمان اور ربیعہ نے تو پہلے سے ہی بکے آرڈر کر رکھے تھے۔ شرط جیتنے کے لیے پچھلے دو ماہ کی ساری جیب خرچی وہ اس ایڈونچر پر صرف کر چکے تھے۔ بھلا کسی کو کیا خبر ہوتی کہ پھول کسی نے دیے ہیں یا انہوں نے خود خریدے ہیں۔

ادھر خولہ اور ہالہ صرف پیدائش میں جڑواں نہ تھیں۔ عادات اور سوچ بھی یکساں تھی دونوں نے پچھلے کئی دن کی نیند برباد کر کے اپنی استعمال شدہ جیولری، سوٹ پیس اور گھر پر ہی موجود قدرے بہتر حالت میں موجود ڈیکوریشن پیس کو ویلنٹائن کے حوالے سے چمکیلے ریپرز میں سجا کر وہ تحائف تیار کیے تھے جن پر لکھے نام ان لوگوں کے تھے جن کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہاں کون سی سی آئی ڈی لگی تھی جو اصل بات جان سکتی۔ چیٹنگ میں نمبرون ثانی بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ تمام موبائل نیٹ ورکس کے تمام ایس ایم ایس اور کال پیکیجز سے جتنا فائدہ اٹھا سکتی تھی اٹھایا دن دگنی رات چوگنی کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے اتنے فرینڈز بنا چکی تھی کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کی سحر طراز باتوں میں گرفتار دوستوں میں سے اگر نصف نے بھی گلاب کا ایک ایک پھول بھیجا تو وہ یقیناً شرط جیت جائے گی۔

اب اتنے پاور فل ایونٹ پر رازی نے ایک دن پہلے شریک ہونے سے معذرت کرلی۔



”ہاؤ سلی یو آر رازی، تم ویلنٹائن پارٹی میں آنے سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟“ ثانی نے اپنی دل گرفتگی اور اچنبھے سے کہا۔ گویا کوئی گمراہ رمضان کا فرض روزہ بنا کسی عذر کے چھوڑ دے تو یہ سن کر کسی واعظ کو بھی اتنی تکلیف نہ ہوگی جتنا ویلنٹائن ڈے پر نہ آنے کا سن کر رازی کے گروپ فرینڈز پر گزر رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں یہ پارٹی میں آنے سے کیوں انکار کر رہا ہے۔“

نعمان نے رازی کی مسلسل خاموشی پر نکتہ اٹھایا۔

وہ رازی کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور باقی تمام دوست



دونوں کے درمیان 'رازی کی خاموشی اور نعمان کے اچانک تجسس پھیلانے پر سب نے ایک ساتھ رازی کی طرف سے گردن گھما کر نعمان کی طرف موڑی جیسے ریڈار گھومتا ہے۔

"کیونکہ اس کو کسی نے لفٹ ہی نہیں کرائی اور گلاب کا پھول کیا۔ اسے تو کوئی گلاب کی پتی بھی نہ دے۔ یہ شرط ہارنے کے خوف سے بھاگنے کے چکر میں ہے۔"

نعمان اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات لایا تھا۔ مگر کسی نے اس کی اس بات کو اہمیت نہ دی۔

"یار لاسٹ ٹائم دادو نے مجھے سرپرائز کیا تھا۔ اس بار مجھے انہیں سرپرائز دینا ہے۔ میں تیرہ فروری کی رات کو پاکپتن چلا جاؤں گا۔ تاکہ چودہ فروری کا سورج جب طلوع ہو تو میری دادو سب سے پہلے میرا چہرہ دیکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے بڑا تحفہ ان کے لیے ویلنٹائن ڈے پر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

رازی نے ویلنٹائن پارٹی میں شرکت کی جو وجہ بتائی تھی۔ وہ بلاشبہ سب کے لیے حیرت سے کم نہ تھی۔ ویلنٹائن جیسا حسین و رومانوی دن جسے ظاہرا" ایک دھڑکن رکھتے دو دلوں کے وصال کا دن کہا جاتا ہے۔ مگر در پردہ شرم و حیا' حدود و قیود سے ماورا غیر اخلاقی حرکتوں کے، داؤ پیچ کا دن ہے اور منانے والے وہ جو عشق کے ہجر و وصال کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔

ویلنٹائن کے بابت ایسی سوچ رکھ کر پروان چڑھنے والی نئی نسل کے لیے دادی اور پوتے کے مابین ایسی کسی سرگرمی کا ہونا باعث حیرت نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔



"ثانی کیا بات ہے مائی ڈیر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

وہ پارہ صفت طبیعت کی مالک تھی۔ سکون سے بیٹھنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث من پسند لائف گزارنے کے تمام حق رکھتی تھی۔ عید' شب برات اسے یاد ہو نہ ہو نیو ایئر اور ویلنٹائن ڈے پر اس کا جوش و خروش دیدنی ہوتا تھا۔ فادر ڈے پر پاپا کو شرف ملاقات بخشتی تھی تو مدر ڈے پر ماما کو لفٹ کراتی تھی۔ بزنس میں الجھے فادر اور ویلفیئر ایکٹوٹیز میں مصروف ماما کے لیے یہی بہت تھا۔ مگر اس نئے سال کی ویلنٹائن پر کیا عجب ہوا کہ ثانی منہ سر لپیٹے روم بند کیے بیٹھی تھی۔ ماما کی تشویش بجا تھی۔

"ماما! اس اسٹوپڈ رازی نے سارا پروگرام خراب کر دیا۔ ویلنٹائن منائے گا اپنی دادو کے ساتھ' کتنی اسٹوپڈ سی بات لگتی ہے یہ۔"

ثانی بھڑک رہی تھی۔ رازی کی حرکت کا سن کر ماما کو بھی حیرت ہوئی۔ ویلنٹائن ڈے پر بوڑھوں کا کیا کام۔

"اس دقیانوسی کو رہنے دو' یہ کنویں کے مینڈک نہ خود خوش ہوتے ہیں' نہ دوسروں کو ہونے دیتے ہیں' تم اپنی سیلیبریشن کرو۔"

ماما نے بھی خوب ناک چڑھا کر رائے زنی کی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ سیلیبریشن تو ہوتا ہی تھی۔ دیگر احباب تو تھے ہی۔ مگر رازی کے بنا اس کا دل کہاں خوش ہوتا تھا؟

رازی نے نہ صرف خود ویلنٹائن کی شکل تبدیل کر دی تھی۔ بلکہ ان سب کو بھی مشورہ دیا تھا کہ شرط کے انداز کو قدرے ترمیم کے ساتھ رکھا جائے۔ گلاب کے پھول بکے کے ساتھ گلدستہ دعا بھی ایڈ کیا جائے۔ جو اس دن سب سے زیادہ دعاؤں کا ذخیرہ اکٹھا کرے گا وہی ونر ہو گا اور دعاؤں کا خزانہ ان بزرگوں کے پاس ہے جنہیں ہم کھنڈرات کہہ کر خود سے دور کر دیتے ہیں۔



"میری دادو' تایا ابو کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ لاہور شفٹ ہو جانے کے بعد میرا ان سے کئی سالوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ بابا کب جا کر ان سے مل آتے تھے۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ فون پر ان کی مٹھاس بھری آواز دل کو اچھی لگتی تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ دوڑ' دوڑا چلا جاؤں۔ مگر لاسٹ ایر دادو دل کے ہاتھوں مجبور اپنے پوتے کا چہرہ دیکھنے کے لیے اچانک چلی آئیں۔ انہیں ویلنٹائن کے بابت کچھ خبر نہیں۔ وہ کوئی تحفہ یا پھول نہیں لائی تھیں۔ ہاں اتفاق تھا کہ جب وہ میرے سامنے آئیں تو کیلنڈر پر چودہ فروری کھلکھلا اٹھی تھی۔ میرے ہاتھوں میں تحائف کا ڈھیر تھا جو میرے فرینڈز کے لیے تھا۔ مگر وہ بوسہ جو میری پیشانی پر ان کپکپاتے ہونٹوں نے دیا۔ بائے گاڈ دنیا کا کوئی تحفہ اس لمس سے قیمتی نہ تھا۔ کوئی سیلیبریشن اس ایک Hug سے بڑھ کر نہ تھی جو دادو کی نحیف بانہوں میں میں نے منائی۔ یوم وفا اگر منانا ہے تو اس مقدس رشتوں سے مناؤ' سچی خوشی پاؤ گے۔"

رازی انہیں قائل کرنے کے درپے تھا۔ جن کے چہرے کے زاویے قطعا" دیکھنے کے لائق نہ تھے۔

"میرے خیال میں رازی' تمہیں تبلیغی جماعت جوائن کر لینی چاہیے۔"

نادر نے تمام تر تبلیغ کو پھونکوں سے اڑاتے ہوئے

طنزیہ کہا۔
"وفا گر... ہوئے پھولوں میں نہیں یارو.. ان بزرگوں میں ہی ملے گی۔ تمہارے قیمتی پھول کا حق دار ہر ایرا غیرہ نہیں، بلکہ وہ ہیں جو تمہاری اصل تمہاری پہچان ہیں۔ محبت سڑکوں پر نہیں، اپنوں سے رابطوں میں ملتی ہے۔ مسلی ہوئی کلیوں کے تحفے تمہیں کیا لطف دیں گے، جو ان بوڑھے لبوں سے نکلی دعائیں تمہیں دیں گی۔"

رازی پر کسی طنز و تحقیر کا اثر نہیں تھا۔ وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ نسل نوموم کی مانند ہوتی ہے۔ جس سانچے میں ڈھالو ڈھل ہی جاتی ہے۔



"پاپا! آپ کے پیرنٹس کہاں ہیں؟"
ثانی کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ ناشتے کی میز پر شاذو نادر ہی اکٹھا ہوتے اس کے ماں، باپ کو حیرت زدہ کر دیا۔ ثانی جیسی موج مستی میں مگن لڑکی سے ایسے استفسار کی امید ہی کب تھی؟
"کیا بات ہے ثانی! تمہیں بھی رازی والا وائرس تو نہیں لگ گیا۔"
"او نو ماما! میں تو بس جسٹ فار انفارمیشن پوچھ رہی تھی۔"
پاپا جو رازی والے قصے سے واقف تھیں۔ طنزیہ بولی تھیں۔
"ثانی! آپ کے دادا ابو کا انتقال ہو گیا ہے اور دادی ماں گاؤں میں رہتی ہیں اکیلی۔"
پاپا کے اچھی خاصی سوچ بچار کے بعد مختصر جواب دینے پر ثانی نے اچنبھے سے "اکیلی؟" کہا۔
"نہیں! ایک غریب فیملی کو ساتھ رکھا ہوا ہے۔ انہی کے مسائل میں الجھی رہتی ہیں۔"
پاپا کا ہر سوال کا جواب دینا ماما کو اچھا خاصا کھٹک رہا تھا۔ اوپر سے پاپا کی جھکی نگاہیں، ہلکی سی پشیمانی کا عکس انہیں غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔
"آپ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں اور ثانی... فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔"
ماما بیک وقت دونوں کو اس فضول موضوع سے دور کرنے کی غرض سے گویا ہوئیں۔ بھلا جنہیں شادی کی ابتدا سے ہی مکھن میں سے بال کی طرح نکال دیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد ان کا تذکرہ چہ معنی دارد...



"رازی! تم اب تک اپنی ضد پر اڑے ہو یار! صرف پانچ گھنٹے رہتے ہیں ویلنٹائن ٹائم اسٹارٹ ہونے میں۔ کل کا دن کتنی موج مستی کا ہوگا۔ تم اپنی دادو کو کسی اور دن سرپرائز دے دینا۔ ان کے لیے تو سارے دن ہی ویلنٹائن ہیں۔ 14 فروری کو ضائع مت کرو۔" ثانی اس دن کے واک آؤٹ کے بعد آج پھر گروپ ڈسکشن میں شامل ہوئی تھی اور سب کی طرح اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔
"دادو نہیں جانتیں 14 فروری کیا ہے؟ میں تو جانتا ہوں اور میں اپنا ویلنٹائن ڈے شاندار بنانا چاہتا ہوں۔"
"دادو سے لپٹ کر؟"
ہالہ نے اس کے انوکھے شوق پر چوٹ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔ اس کی بات پر منہ بسورتے سب کے قہقہے نکل پڑے۔
"آف کورس! کیا ہی مہک تمہارے گلاب کے کاغذی پھولوں میں ہوگی جو میری دادو کے ٹچ میں ہے۔"
رازی اگر انہیں قائل نہیں کر پا رہا تھا تو یہ کوشش ان ساتوں کی بھی کامیاب نہ ہو رہی تھی۔
"بٹ رازی! اگر گرینڈ پیرنٹس نہ ہوں تو پھر۔"
عباد کے سوال نے سب کو چونکا دیا۔ وہ اب تک کے تمام مباحثے میں محض خاموش تماشائی تھا۔ اس کی کشمکش کا اصل کیا تھا۔ اب سامنے آیا تھا۔
"سوواٹ! ایسے رشتے کبھی مرتے نہیں، زندگی میں نہیں ملے تو اس ویلنٹائن پر ایک کلی ان کی قبر پر رکھ

دینا۔ ایصال ثواب کے لیے ایک بار درود پاک پڑھ لینا' سب سے بیسٹ ویلنٹائن تمہاری ہی ہوگی۔"

"واٹس انف رازی! تمہارا لیکچر اب میری برداشت سے باہر ہے۔"

ثانی اس نئے سبق پر آگ بگولہ ہو کر ایک بار پھر واک آؤٹ کر گئی۔

"رازی! میرے دادا' دادی ہمارے ساتھ ہی گھر کے ایک روم میں رہتے ہیں۔ میں نے انہیں آخری بار کب سلام کیا تھا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں۔ اصل میں امی ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتیں اور ابو نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔"

نادر ماحول کے زیر اثر آتے ہوئے ان کا ذکر کرنے لگا۔

"تو دیر کس بات کی ہے۔ اس ویلنٹائن پر لیٹس ڈو اٹ! رازی نے فوراً" حل پیش کیا۔

"بٹ رازی! میری وہ درجن بھر گرل فرینڈز کا دل ٹوٹ جائے گا۔ جن کے ساتھ میں نے کل ویلنٹائن منانی ہے۔"

نعمان نے خباثت سے پر انداز میں کہا۔ لیکن اس کی بات میں بھی متفق ہونے کی جھلک ملتی تھی۔

"درجن کے قریب فیک فرینڈز کے لیے تمہارے پاس ٹائم ہے۔ صرف چند منٹس رئیل رشتوں کے لیے نہیں نکال سکتے۔ اگر انہوں نے تم میں اپنی تربیت کے رنگ نہ بھرے ہوتے تو آج تم رنگ رلیاں منانے کے لائق نہ ہوتے۔"

یہ لیکچر رازی کے نہیں ہالہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ سب دم سادھے اس کی صورت دیکھنے لگے۔ رازی نے باقاعدہ تالیاں بجائیں۔ ہالہ کی جڑواں خولہ کیا سوچ رکھتی تھی۔ کہنا ضروری نہ تھا۔ وہ دونوں اور ان کی سوچ ایک دوسرے کا پرتو تھی۔



14 فروری کلینڈر کا ایک عام سا دن' کس من چلے' دل جلے' سرپھرے نے اسے "محبتوں کا دن" بنا کر نوجوان نسل کو ایک نئی جہت عطا کی۔ کاش وہ سامنے آتا تو اسے بتاتے کہ ہمارے' اولڈ ہومز میں بھی اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ تہوار خود غلط نہیں ہوتے۔ انہیں منانے کا انداز اس کے صحیح یا غلط ہونے کا تعین کرتا ہے۔

"آج کے دن کا ونر کون ہے؟؟"

رات گئے اکٹھے ہوئے' والے دوستوں نے شرط کے حوالے سے دریافت کیا۔ نہ تو نعمان اور ربیعہ نے خود ہی سے خریدے بکے 'نکالے' نہ نادر اور عباد کی فیک فرینڈز نے تحائف کے انبار بھیجے۔ نہ ہالہ اور خولہ خود ہی سے بنائے گفٹ سامنے لا سکیں۔ پھر شرط کس بات کی اور ونر ہونے کا کیا جواز؟

"اگر تم لوگ وہ نشان محبت دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو جو میری دادو نے بوسوں کی صورت مجھے گفٹ کیے ہیں تو یقیناً" ونر میں ہی ہوں۔"

رازی نے اپنی ماتھے' گال' ناک' تھوڑی کو انگلی سے چھو کر تفاخر سے کہا۔

"نہیں... اگر میرا چہرہ تمہیں وہ خوشی دکھا سکتا ہے جو میرے دادا' دادی کو آج کی صبح میرے ان کے پاس جاکر سلام پیش کرنے سے حاصل ہوئی تو ونر میں ہوں گا۔"

نادر کے لہجے میں سچی خوشی کی جھلک چھپائے نہ چھپتی تھی۔

"نہیں... وہ ایک پھولوں کا ہار جو میں اپنے مرحوم دادا' دادی کی قبر پر چڑھا کر آیا ہوں۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ شرط تو میں ہی جیتا ہوں۔"

عباد کو معلوم نہیں پتھر کی قبر سے سکون و محبت کو کون سے خزانے ملے تھے کہ اس کا چہرہ سورج کی مانند دمک رہا تھا۔

"تم لوگوں کے پاس صرف الفاظ ہیں جو نظر نہیں آتے۔ لیکن دیکھو! میرے پاس ثبوت ہے کہ شرط میرے ہاتھ سے کہیں نہیں گئی ہے۔"

ربیعہ نے سو روپے کا مڑا تڑا بوسیدہ نوٹ سب کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ سب بن کہے جان گئے کہ

چائے کا ایک کپ پلانے پر دادا نے پوتی کو انعام الفت سے نوازا تھا۔

"ہمارے دادا دادی نہیں ہیں مگر آج تایا ابو اور پھپھو کے لیے کیک اور بکے لے جاتے ہوئے ہم نے محبت و روابط کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ہم سے جیت کے دکھاؤ۔"

ہالہ اور خولہ نے تفاخر سے فرضی کالر جھاڑ کر سب کو دیکھا۔ کوئی شک نہیں کہ ونر کہلائے جانے کے بہت قریب تھیں وہ دونوں۔

"ہرگز نہیں۔ تم نے کوئی تیر نہیں مارا میرے گرینڈ پیرنٹس نہیں۔ پاپا اکلوتے ہیں ان کے کوئی بہن بھائی نہیں۔ میں نے ایک پیارا سا گفٹ اپنے پڑوسی احسن صاحب کو پیش کیا۔ اب بتاؤ انعام کی رقم کہاں ہے؟"

نعمان کو درجن کے حساب سے کم عقلوں کو گفٹ بانٹتے "ایک کار خیر کا خیال آنا یقینا" آئندہ کے لیے مثبت نتائج سامنے لے کر آئے گا۔

"بٹ رازی! ثانی نہیں آئی۔"

ربیعہ نے اچانک اس طرف توجہ مبذول کرائی تھی مگر یہ بات تو سب ہی کے دلوں میں کھب رہی تھی۔ وہ ان کے گروپ کی سب سے دل عزیز ممبر تھی۔ اس موقع کے لیے تو سب سے زیادہ پرجوش بھی وہی تھی مگر اس انوکھی ویلنٹائن پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ سب اس کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگے۔

رازی کو نمبر ڈائل کرتے دیکھ کر سب جان گئے کہ وہ ثانی کو فون ملا رہا ہے۔

"ہیلو آنٹی! رازی بات کر رہا ہوں۔ ثانی کہاں ہے؟" ثانی کا موبائل مسلسل آف جاتا دیکھ کر اس نے اس کی ماما کا نمبر ملایا تھا۔

"محترم واعظ صاحب! وہ آپ کے کہے پر زیادہ ہی کنسنٹریٹ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ماما کے کہے کو بھی اگنور کر دیتی ہے۔"

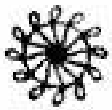
چبا چبا کے بولتی آنٹی مزید بات کے موڈ میں نہ تھیں۔ عمران کے کہے چند الفاظ رد کیے جانے لائق نہیں تھے۔ اسی لیے رازی نے فوراً ثانی کے پاپا سے رابطہ کیا۔

"ہاں بیٹا! ثانی کے دل میں نجانے کیا سمائی؟ وہ آج صبح اپنی دادی ماں سے ملنے گاؤں چلی گئی ہے۔"

ثانی کو کس لمحے ہدایت کے تحفے نے سرفراز کیا کہ وہ بھی اس نئی ویلنٹائن کی سیلیبریشن کا حصہ بن گئی۔

سب کی خوشی دیدنی اور فطری تھی۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ تالیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ خوشی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ ثانی کے عمل نے سب کے دل کے شگوفے کھلا دیے تھے۔ نہ کسی نے زبان سے کچھ کہا، نہ بحث و تکرار ہوئی اور ایک سرپھری 'من موجی' نئی تہذیب کے رنگوں میں رنگی ثانی خود بخود اس ویلنٹائن کی فاتح قرار پا گئی تھی۔

ایک بند کمرے میں آٹھ نفوس نے ویلنٹائن کا ایک نیا انداز ایجاد کیا تھا۔ گر اللہ نے چاہا تو ایک دن ساری دنیا اس پر عمل پیرا ہوگی۔ خوشیوں کے مواقع جتنے ہوں، کم ہیں، مگر ہر تہوار تہذیب و اقدار کے جامے میں ہو تو سچی خوشی تخلیق پاتی ہے۔



کنیز نور علی

پالیسی

نیا چینل پر میزبان بول رہا تھا۔

"ناظرین! موجودہ صورت حال کے بارے میں ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہم سے بات کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اپوزیشن کا موقف آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسکرین پر مناظر دیکھ سکتے ہیں کہ پرامن مظاہرین پر تشدد کیا جارہا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہم تازہ ترین اطلاعات سب سے پہلے آپ تک پہنچارہے ہیں۔ آپ کو بتاتے چلیں کہ اپوزیشن پارٹی کے ترجمان نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ہمارے ارکان کامل طور پر پرامن ہیں اور احتجاج کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔ ایسے میں حکومتی رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک طرف حکومت جمہوریت کے راگ الاپتی ہے، اور دوسری طرف کھلم کھلا ریاستی دہشت گردی کی جارہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت نے سازش کے ذریعے ہمارے پرامن مظاہرین پر تشدد کرنے کی کوشش کی لیکن عوام نے ان کی سازش کو ناکام بنادیا ہے تو حکومت اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور پولیس پرامن مظاہرین پر پل پڑی۔ پولیس کو ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا موجودہ حکومت کا شیوہ رہا ہے۔ یہ کہنا تھا اپوزیشن پارٹی کے ترجمان کا۔

انہوں نے مزید کہا کہ پولیس گردی کے ذریعے حکومت عوام کی آواز کو دبا نہیں سکتی اور دوسری طرف۔ ناظرین! ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی وزیر اطلاعات سے رابطہ کیا تو انہوں نے ہم سے بات کرنے سے ہی انکار کردیا۔

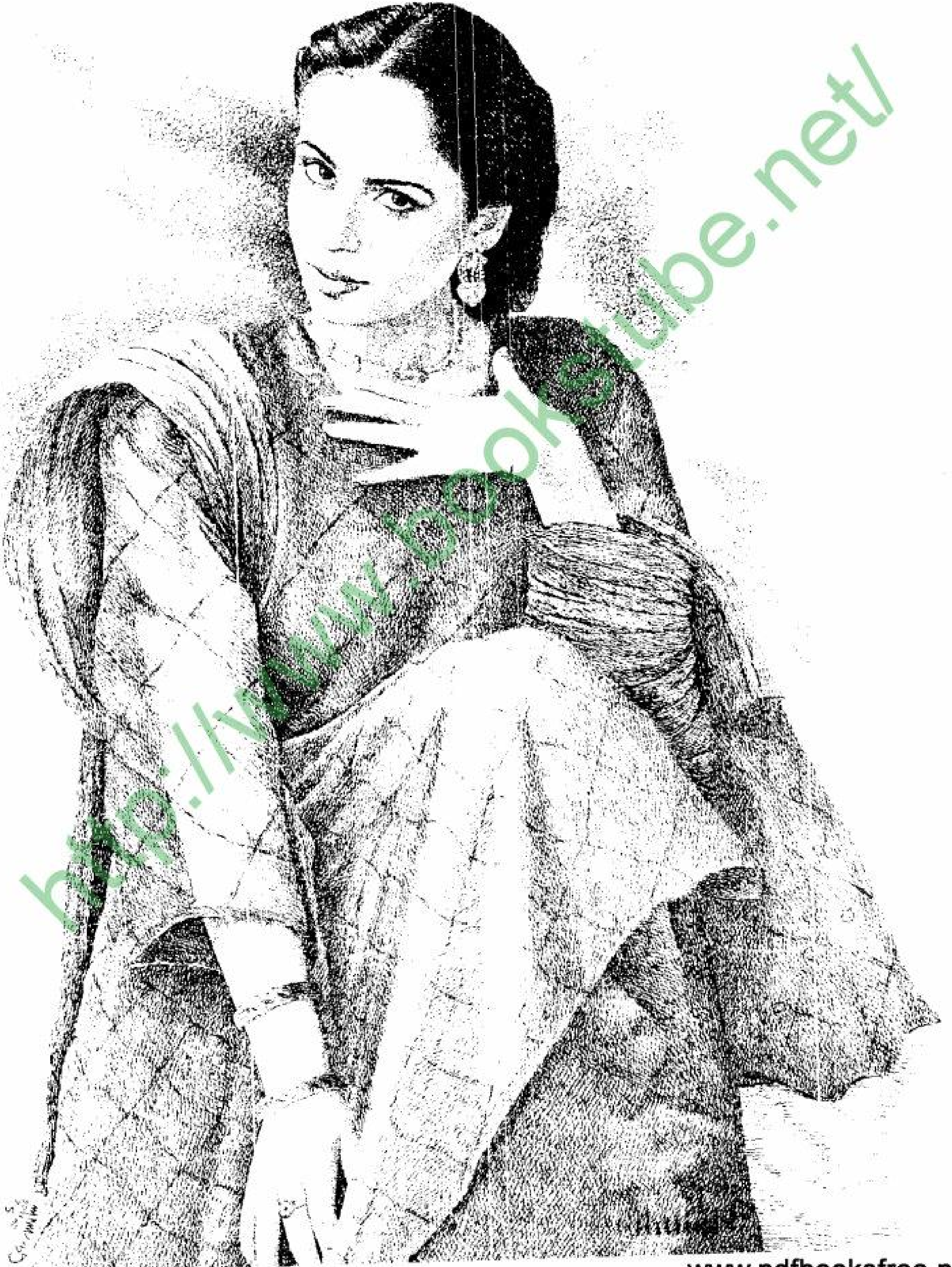
ناظرین! ہماری ہمیشہ کوشش رہی کہ دونوں اطراف کا نقطہ نظر آپ تک پہنچائیں۔ ہم نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی سب سے پہلے نیوز بریک کی اور ہر لحہ بدلتی ہوئی صورت حال کی مکمل خبر فوٹیج کے ساتھ آپ تک پہنچائی۔ ناظرین! وفاقی وزیر اطلاعات نے ہم سے بات کرنے سے انکار کردیا ہے۔ کیا یہ آزادی اظہار کی نفی نہیں ہے۔ حالانکہ ہم دونوں اطراف کا نقطہ نظر واضح طور پر آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں اسکرین پر مناظر۔ حکومت کی جانب سے کوئی عہدیدار اس حوالے سے بات کرنے کو تیار نہیں۔" میزبان اپنے چینل کی پالیسی کے مطابق حکومت کو رگید رہا تھا۔

صبا نے اگلا چینل بدلا۔ پیلا چینل آگیا تھا۔ یہاں کی میزبان بہت روانی سے کہہ رہی تھی۔

"ناظرین! حکومت صبر و تحمل اور برداشت سے کام لے رہی ہے اور پرتشدد مظاہرین کو آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ کیسے وہ لاٹھیاں اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے ہیں اور توڑ پھوڑ میں مصروف ہیں۔ وفاقی وزیر اطلاعات نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کی ہے جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ حکومت قانون ہاتھ میں لینے والوں کے خلاف کارروائی کرے گی۔ عوام کے جان و مال کی حفاظت ہماری اولین ترجیح ہے۔ تشدد، دھمکی اور دھونس کے حربے استعمال کرنے والے جان لیں کہ ہم ڈرنے والے نہیں۔ احتجاج

آپ کا حق ہے لیکن قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ پولیس اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے کارروائی کرے گی۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ یہ کہنا تھا وفاقی وزیر اطلاعات کا۔ ناظرین! انہوں نے مزید کہا کہ اپوزیشن پارٹی کے لیڈر مسلسل عوام کو اشتعال دلا رہے ہیں۔

ناظرین! تازہ ترین خبر آپ تک پہنچائیں کہ مظاہرین پولیس پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈنڈے اٹھا رکھے ہیں۔ مشتعل مظاہرین اس سے پہلے



کچھ گاڑیوں کی توڑ پھوڑ کر چکے ہیں۔ جس کی فوٹیج آپ اس وقت اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ حکومتی موقف آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ وفاقی وزیر اطلاعات نے کہا ہے کہ حکومت صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کررہی ہے۔ تشدد کی راہ اپنانے والوں کو اپنے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ پاکستانی عوام ایسے طرز سیاست کو رد کرتے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی کو ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔"

پیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق اپوزیشن پارٹی کو رگید رہا تھا۔

صبا کے ماتھے پر فکرمندی کی لکیریں اور گہری ہوگئی تھیں۔

"ابا! یہ کیا بنے گا۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی پھیل گئی تھی۔ "ملک کے حالات...."

سوال ادھورا ہی رہ گیا اور وہ یاسیت سے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتی چپ سی ہوگئی۔ بھلا کیا بولے۔ یہ تو ایک روایتی سا گھسا پٹا سا جملہ ہوگیا ہے کہ ملک کے حالات کب بدلیں گے۔ کیا بنے گا۔ اب تو پوچھتے ہی حیا آتی ہے۔ ڈر لگتا ہے' خوف آتا ہے کہ کیا پوچھ رہے ہیں، لیکن پاس ہی بیٹھے ابا اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب متوجہ ہوچکے تھے۔

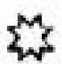
انہوں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہر چینل کی اپنی پالیسی ہوتی ہے نا۔ نیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق کام کرتا ہے اور خوب خوب کما رہا ہے۔ پیلا چینل اپنی پالیسی کو فالو کرتا ہے۔ وہ بھی خوب چل رہا ہے۔ ایسے ہی تم بھی سوچ لو' بلکہ ہر وہ شخص جسے یہ سوال تنگ کرتا ہے۔ ملک کے حالات والا سوال کرنے والا بھی اپنی ایک پالیسی بنالے اور پھر اس پر کام شروع کرلے۔ پھر اور کچھ نہ بھی بدلا تو وہ ایک شخص ضرور بدل جائے گا۔ اپنی پالیسی بناؤ اور شروع ہوجاؤ۔ ادھر ادھر نہ دیکھو۔ وقت سونے' ہیروں' جواہرات سے بہت بہت' زیادہ قیمتی ہے۔ اسے ایک دھن میں ایک مقصد میں لگاؤ۔ پھر تمہیں یہ سوال تنگ نہیں کرے گا۔ سارا دن تم یہ نیلے پیلے ہرے چینل دیکھ کر اپنا سونے جیسا وقت سیاہ کرتی ہو۔ یہ ایک بات ہی سیکھ لو ان سے' پالیسی بنانا اور اس پہ چل پڑنا۔" ابا شاید اس کے فارغ رہنے سے زیادہ ہی عاجز آئے بیٹھے تھے۔

صبا بھی پاکستان کے ڈھیر سے لوگوں کی طرح ٹی وی اور انٹرنیٹ کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس نے ابا کی ساری گفتگو کو ذہن میں جما کر رکھنے کی سعی کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں ارادے کی مضبوطی کی چمک تھی' لیکن اس کی اپنی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔ بے حوصلگی تھی' جسے ابا نے پڑھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس پر ہر تھوڑے عرصے بعد ایسے ڈپریشن کے دور آتے ہیں کہ وہ ٹوٹ سی جاتی ہے۔ ایسے میں وہ اکثر باتوں سے اس کا کتھارسس کرتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اب وہ اس ذہنی رو پر قابو پائے۔ کوئی راستہ اپنائے' کوئی مقصد چنے' بس فارغ نہ رہے۔ وہ ایک بار پھر مضبوط لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

"تم اپنے حصے کا کام کرو' اپنے حصے کی شمع جلاؤ' جب تک ایسا نہیں کروگی' تب تک ایسے ہی چیزوں پر تم کڑھتی رہوگی۔ کبھی ملک کے حالات پر روؤگی' کبھی معاشرے میں ہونے والی ناانصافی پر کڑھوگی۔ کبھی گھریلو جھگڑے تمہیں پاگل کرویں گے۔ کبھی دوسروں کی خودغرضی تمہیں گھائل کروے گی۔ کیونکہ یہ چینلز تو صرف پیسہ کما رہے ہیں۔ رہی حکومت تو حکومت اور اپوزیشن دونوں کچھ نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے عوام نے' ہماری نوجوان نسل نے کرنا ہے۔ خود کو پہچانو۔ اگر ہر شخص اپنے حصے کا چراغ جلائے تو چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ اندھیرے کو مٹانے کے لیے آگے بڑھنا پڑے گا۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صبا کو محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھ کے لمس کا سکون اس کے اندر داخل ہورہا ہے۔

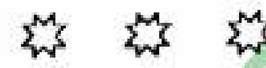


نظیر فاطمہ



پنجابی کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ ''کوئی رکھ وی کدی کلا نہ ہوئے۔'' (کبھی کوئی اکیلا اور تنہا نہ ہو۔) بالکل سولہ آنے درست ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کلا پتر یعنی اکلوتا بیٹا بھی کسی کا نہ ہو۔ خاص طور پر وہ بیٹا جو سات بیٹیوں سے چھوٹا ہو۔

میں سرمد ہوں۔ فضل داد کا اکلوتا سپوت میرے بچپن سے لے کر اب تک جب کہ میرے دونوں بیٹے بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، بہنوں کے ہاتھوں میری کیسے کیسے درگت بنی ہے۔ مت پوچھیں۔ بچپن میں میرا منہ چوم چوم کر میرے چہرے کا گوشت تک گھسا دیا۔ آج تک میرے چہرے پر ماس نہیں آیا۔ سارا سارا دن مجھے گود میں اٹھائے پھرتیں کہ میرے ساتھ کے لڑکے فٹ بال کے پیچھے بھاگنے لگے تو میں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ وہ بھی اللہ بھلا کرے میری دادی کا جنہوں نے رولا مچا کر مجھے ان کی گودوں سے نیچے اتروایا۔



جب تک میں جوان ہوا، میری ساتوں بہنیں شادی شدہ ہو چکی تھیں۔ جب میں نے کمانا شروع کیا تو سمجھو میری بہنوں کی لاٹری نکل آئی۔ وہ اپنی بہت سی ضرورتوں کے لیے میری تنخواہ کا بڑا حصہ لے اڑتیں۔ اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ باریاں لگا رکھی تھیں۔ جیسے ہی میری تنخواہ آتی، میری وہ بہن جس کی اس مہینے باری ہوتی، اپنے کسی مسئلے کے ساتھ آ موجود ہوتی۔ کسی کی چھت ٹپکنے لگتی، تو کسی کی پانی والی موٹر جل جاتی۔ جس طرح قیام پاکستان سے پہلے پنجاب گورا صاحب کے نزدیک "فروٹ گرین باسکٹ آف انڈیا" تھا۔ بالکل اسی طرح میں اپنی بہنوں کے لیے "فروٹ باسکٹ آف فضل ہاؤس" تھا۔

ابا کو جب ان کی اس کارروائی کا ادراک ہوا تو وہ کمر کس کر سیدان میں آ گئے۔ تنخواہ ملتے ہی میری ساری تنخواہ اپنے قبضے میں لے لیتے اور مجھے خرچا دے کر باقی بچت کے خانے میں ڈال دیتے۔ یہ بات میری بہنوں کو بہت ناگوار گزری۔

"اماں! کبھی کبھی تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم ابا کی سوتیلی بیٹیاں ہیں۔ کیا تھا جو سرمد ہماری تھوڑی بہت مدد کر دیتا تھا۔ ہم بہنیں ہیں اس کی۔ حق بنتا ہے ہمارا اس پر۔" بہنوں نے ہاتھ نچا نچا کر اماں سے شکوہ کیا۔

"وہ کہتے ہیں شادی کے بعد تم لوگ اپنے شوہروں کی ذمہ داری ہو، باپ اور بھائی کی نہیں۔ تمہارے شوہر جتنا کماتے ہیں ہم لوگ اسی میں گزارا کرنا سیکھو۔"

"ابا تو ہمیں ویسے ہی ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں۔" بڑی آپا نے لمحوں میں ابا کی ساری محبتوں کو بھلا دیا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ شادی سے پہلے کیسے تم لوگوں کو لاڈ اور چاؤ سے رکھا ہوا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے تم لوگوں کو اچھا کھلایا، اچھا پہنایا اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھے گھروں میں تم لوگوں کی شادیاں کیں۔ برے بھلے وقت میں بہن، بھائی ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں مگر تم لوگوں نے تو روز کا تماشا ہی بنا لیا تھا۔ اسی لیے تمہارے ابا نے یہ قدم اٹھایا ہے۔" اماں نے ایمان داری کی انتہا کر دی۔

"تو سرمد کے کون سے بچے ہیں جن پر اسے خرچ کرنا ہے۔" چھوٹی آپا بھی تنک کر بولیں۔

"ابھی نہیں ہیں نا۔ شادی کریں گے تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ بس تم لوگ اس کی کمائی پر نیت نہ لگایا کرو۔" بات بنتی نہ دیکھ کر ساتوں نے خاموشی اختیار کر لی۔



میری سب بہنوں کی شادیاں بھرے پرے گھروں میں ہوئی تھیں۔ جہاں وہی ساس، نندوں کی روایتی چپقلش عام تھی۔ جب گھر میں میری شادی کا ذکر شروع ہوا تو ساتوں باری باری آ کر اپنے سسرالیوں کے مظالم سناتے ہوئے یوں روئیں کہ سیلاب کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ وہ تو ابا کی دھاڑ نے انہیں چپ کروایا، ورنہ تو شاید سارا گاؤں ان کے آنسوؤں میں بہہ جاتا۔

قصہ یہ تھا کہ ان سب کی کوئی نہ کوئی نند کنواری تھی اور ہر کوئی یہ چاہتی تھی کہ میری شادی اس کی نند سے ہو، تاکہ وہ اس کی نند بن کر گن گن کر بدلے لے سکے اور اپنے سسرالیوں کو ناکوں چنے چبوا سکے۔ بہنوں کو روتے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں ساتوں کی نندوں

سے شادی کرلوں، سب کا بھلا ہوجائے گا۔ مگر ایسا میں صرف سوچ ہی سکتا تھا کہ اول تو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے ابا کو ان جنجال پوروں سے لڑکی اپنے گھر نہیں لانی تھی۔ سو میں اور اماں جب آپاؤں کی دل جوئی کرتے کرتے جذباتی ہونے لگتے ابا میدان میں آکر ان کو وہ کھری کھری سناتے کہ ان کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔

ان سب کی امیدوں پر سو فیصد پانی اس وقت پھرا، جب ابا شہر گئے اور اپنے کزن کی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی بیٹی سے میری بات پکی کر آئے۔ اماں کو تو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تھا، سو وہ ابا کی خوشی میں شریک ہو گئیں۔ آپاؤں کو خبر ہوئی تو اکٹھی آکر یوں روئیں جیسے خدانخواستہ کسی کی موت ہو گئی ہو۔ ان کو دیکھ کر پھر جو ابا کو جلال آیا تو پورا گھر ہل گیا۔

"تم لوگ کیا میرے گھر نحوست پھیلانے آگئی ہو۔ میرے اکلوتے پتر کی شادی طے ہوئی ہے اور تم لوگوں نے رونا پیٹنا ڈال دیا ہے۔ چلو نکلو، شام تک مجھے تم میں سے ایک بھی یہاں نظر نہ آئے۔ اگر تم لوگ میرے پتر کی شگن میں خوشی خوشی شریک ہونا چاہو تو منگنی میں آنا، ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ادھر کا رخ کرنے کی۔ رخنہ ڈالنے والوں کی میں ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

ابا سے کچھ بعید نہ تھا، وہ واقعی ٹانگیں توڑ کر ہاتھوں میں پکڑا دیتے۔ اس دھمکی کے بعد سب نے اپنے آنسو تو پونچھ لیے لیکن میری بیوی مطلب ہونے والی سے دل ہی دل میں بیر باندھ لیا اور اسے آٹھ آٹھ آنسو رلانے کا تہیہ کرلیا۔

میری منگنی سے شادی تک انہوں نے میری بیوی کو تنگ کرنے کے جو منصوبے بنائے ان میں سے ایک آدھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتا تو میں حقیقتاً "پریشان ہوجاتا کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔

بدلہ لینے کے حوالے سے انہوں نے جو فہرست بنا رکھی تھی، اس میں پہلے نمبر پر یہ تھا کہ وہ اس کی بری کے لیے ایک سے ایک گھٹیا جوڑا خریدیں گی۔ دوسرے نمبر پر اس کے جہیز کی چیزوں میں رج رج کے نقص نکالیں گی۔ مگر وہ بھول گئی تھیں کہ ابا ان سب کے باپ ہیں۔ اس وقت ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ جب ابا نے بری بنانے کی ذمہ داری ان کو دی ہی نہیں۔ وہ شہر جاکر نادیہ (میری منگیتر) کے ہاتھ پر پیسے رکھ آئے کہ اپنی مرضی سے کپڑے خرید لے۔ جہیز کے ابا ویسے ہی بہت خلاف تھے۔ اپنی بیٹیوں کو تو انہوں نے حسب حیثیت جہیز دیا تھا کہ جہاں ان کی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں، وہاں کے لوگوں کی سوچ ابا جیسی نہیں تھی۔ مگر اپنے بیٹے کی دفعہ تو وہ اپنی من مانی کرسکتے تھے، سو انہوں نے کی۔ گھر میں اللہ کے فضل سے ہر چیز موجود تھی۔ ابا نے میرے کمرے میں نیا فرنیچر، قالین اور پردے ڈلوا کر کمرا شادی تک لاک کردیا۔

"اے سرمد! تو... تو ابھی سے تم بہنوں کو بھول گیا ہے۔ بیوی کے آنے کے بعد تو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے ہی نکال دے گا۔" میں دفتر سے واپس آکر ابھی موٹر سائیکل کھڑی کررہا تھا، جب صحن میں بیٹھی آپا آنسو بہانے لگیں۔

"آپا! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔" میں فوراً ان کے پاس جا بیٹھا۔

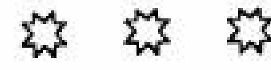
"ہاں اب تو تیری آنکھوں میں تیری ہوتی سوتی بستی ہے۔ ہم تجھے کہاں نظر آئیں گے۔" میری وضاحت پر ان کے دکھ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مزید وضاحتوں پر ان کے دکھ نے ایک سو اسی کی اسپیڈ پکڑلی، جسے بریک ابا کی کھنکھار نے لگائی۔

اسی طرح گرم سرد حالات کا سامنا کرتے ہوئے شادی کا دن آن پہنچا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ آپاؤں کے رویے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا، کیا کچھ ہوسکتا ہے۔ میری بارات جانے لگی تو ساتوں باگ پکڑائی کے بجائے باگ کے ساتھ لٹک ہی گئیں، جس پر گھوڑی نے برا منا کر ادھر ادھر اچھلنا شروع کردیا۔ گھوڑی کے اچھلنے سے ڈر کر جو بھاگیں تو باگ پکڑائی۔ "باگ پکڑائی" میں بدلی اور میں نیچے گرنے سے بال بال بچا۔ خیر ان کے ہر نخرے اور تخریبی منصوبوں کے باوجود نادیہ میرے ساتھ

رخصت ہو کر آ گئی۔

"او کڑیو! اب اور کوئی رخنہ نہ ڈالنا۔ نادیہ کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ' تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کر لے۔"

ابا کو بہو پر بڑے لاڈ آ رہے تھے۔ وہ سب منہ بسور کر اسے کمرے میں چھوڑ آئیں۔



نادیہ بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی۔ ابا تو ویسے ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اماں بھی اس کے ساتھ بڑا گھل مل کر رہتی تھیں، مگر جب ان کی بیٹیاں آ جاتیں تو اماں کے ایسے کان بھرتیں کہ ان کی بہو کی نادیدہ خامیاں بھی نظر آنے لگتیں تو وہ طنز کا ایک آدھ تیر برسا ہی دیتیں۔ نادیہ نے سمجھ داری سے حالات کا تجزیہ کر کے لائحہ عمل اپنایا تھا۔ لہٰذا جب ایسی صورت حال پیش آتی تو وہ خاموش ہو جاتی۔ بعد میں اماں کو اپنے طرز عمل پر افسوس ہونے لگتا کہ انہوں نے ناحق زیادتی کی۔ اپنی زیادتی کی تلافی میں وہ اور میٹھی ہو جاتیں اور نادیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ آہستہ آہستہ اماں نے اس صورت حال پر قابو پا لیا۔ بیٹیوں کی باتیں سن لیتیں، مگر بہو کو کچھ نہ کہتیں۔ کہتیں بھی کیوں' نادیہ نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"ہم آ جائیں تو تیری بیوی کی جان نکلنے لگتی ہے۔ دو بج رہے ہیں' ابھی تک سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ کھانے کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔" آپا نے میری کلاس لی۔

"نا تم سب اپنے ہاتھ پیر اپنے گھروں میں چھوڑ آتی ہو' جو خود اٹھ کر کچھ نہیں کر سکتیں۔ نادیہ کی کچھ مدد ہی کر دو۔ بے چاری کب سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔" نادیہ جب سے امید سے ہوئی تھی ابا کے لاڈ اور بڑھ گئے تھے۔ اب بھی میرے بولنے سے پہلے ان کی جھڑکی سنائی دی تو وہ جو چارپائی پر آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ یوں اٹھیں' جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ ابا کو گھر سے باہر جاتے دیکھ رہی تو انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنا چاہی تھی، مگر نجانے وہ واپس کیسے آ گئے تھے۔

"نادیہ پتر! بس کر اب' یہ روٹیاں میں تنور سے لے آیا ہوں۔" ابا نے روٹیوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"دیکھا اماں! اپنے شوہر کو' تیرے لیے تو تیلا توڑ کر دوہرا نہ کیا اور اب بہو کے لیے روٹیاں بازار سے لے آئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کبھی بازار کی روٹی نہ کھائی ابا نے۔" منجھلی آپا نے اماں کو بھڑکایا۔

"تیرے ابا کے لیے وہ روٹی گھر پر ہی بنائے گی۔" اماں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

"اماں! تو بھی۔۔۔" سب کی سب اماں کے یوں پارٹی بدل لینے پر تڑپ گئیں۔

"ہاں تو وہ دوسرے بی سے ہے۔ سالن اور میٹھا اس نے گھر پر بنا لیا۔ اب تم ساتوں اکٹھی آ گئی ہو۔ ساتوں کے کل ملا کر اکیس تو بچے ہیں۔ وہ کیسے اتنی روٹیاں پکائے۔ خود تو تم میں سے کوئی اٹھ کر پانی بھی نہیں پیتی' مگر ہم تو اس کا خیال کریں گے نا' آخر کو وہ ہمارے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہے۔" اماں کی گنتی پر سب سے چھوٹی آپا بھڑک گئیں۔

"توبہ اماں! تو تو گن گن کر بتانے لگی۔ اب ہم بوجھ ہو گئے۔" ساتوں کے آنسو پلکوں پر آن رکے۔ ساتوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ کسی ایک کے آنسو گالوں پر پھسلیں تو ان کے آنسو بھی آزاد ہوں۔

"تم بیٹیاں ہو اس گھر کا بوجھ کیوں؟ پر دھیو! اس کا بھی تو خیال کرنا چاہیے نا' آخر وہ بھی انسان ہے۔ جب تک وہ فارغ نہیں ہو جاتی' تم لوگ ایک ایک کر کے آیا کرو۔ اگر اکٹھی آؤ تو پھر کام مل کر کر لیا کرو۔" ساتوں کے آنسو بیک وقت گالوں پر پھسلے اور سسکیاں ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔

"تم لوگوں کو کیا ہوا؟" ابا کمرے میں آئے۔ ان کو دیکھ کر ساتوں کے بہتے آنسو یوں خشک ہوئے جیسے بھارت نے ڈیم بنا کر ہمارے دریاؤں کو خشک کر دیا ہے۔

"کچھ نہیں ابا! ایسے ہی دادی مرحومہ یاد آ رہی

تھیں۔" آپا نے بات سنبھالی۔

میں ابا کی صحت اور درازی عمر کی دعا مانگا کرتا تھا کہ وہی تھے جو میری اتھری بہنوں کو قابو کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی بات پر نادیہ کی حمایت کی تھی۔ جس پر ساتوں نے میرے اتنے کان کھینچے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آج یا تو میرے کان الگ ہو کر ان کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے یا ہاتھی کی طرح پنکھے کی صورت تو ضرور ہی اختیار کر لیں گے۔ اس کے بعد میں نے توبہ کی تھی کہ ان کے سامنے کبھی نادیہ کی طرف داری نہیں کروں گا۔ جب بھی میں ابا کی غیر موجودگی میں بہنوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو اپنی بیوی کے بارے میں ان کی لن ترانیاں چپ سادھ کر سنتا رہتا۔ بعد میں نادیہ سے معذرت کرتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

"کوئی بات نہیں، ویسے بھی بڑے بڑے کانوں والا سرمد مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔" وہ کہتی اور ہم دونوں ہنس پڑتے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ نادیہ عام عورتوں کی طرح انا پرست نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھ دار تھی۔ اسے معلوم تھا اپنی نندوں کو کیسے قابو کرنا ہے سو وہ کامیابی سے ان کے ساتھ نباہ کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیسرے نمبر والی آپا کو بات کا بتنگڑ بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ایک دن وہ گھر آئیں تو ابا برآمدے میں بچھی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے سفید صافے سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ انہوں نے سلام کیا تو جواب ندارد، وہ چیخ مار کر بین کرنے لگیں۔

"ہائے ابا! تو ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہائے! دیکھو سب اپنے اپنے مزوں میں ہیں۔ ہائے دیکھو! دونوں میاں، بیوی دن دہاڑے اپنے کمرے میں گھس کر بیٹھے ہیں اور میرا ابا اکیلے پڑا پڑا مر گیا.... ہائے ابا.... ہائے ابا۔"

انہوں نے مجھے اور نادیہ کو یوں لتاڑا جیسے ملک الموت ہم دونوں کے پاس آیا تھا اور ہم نے اسے ابا کی جان نکالنے کی اجازت دے دی ہو، میں نادیہ اور اماں بھاگ کر برآمدے میں پہنچے۔ ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے، کہ صورت حال کو سمجھتے.....

"ہائے ابا... ہائے ابا" کر کے، روتی ہوئی آپا کے منہ سے "ہائے اماں....." کی زوردار آواز نکلی۔

ابا کی لاٹھی دور سے ان کے بازو پر پڑی تھی اور تکلیف کی وجہ سے ان کا راگ یکسر بین بدل گیا تھا۔

"کیا مجال ہے کہ دو گھڑی آرام کر لے بندہ۔ میں سو رہا تھا، مرا نہیں تھا۔" ابا نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"ہائے ابا! سو رہے تھے تو بتا نہیں سکتے تھے۔ لے کے میرے اتنے آنسو ضائع کرا دیے۔" انہوں نے بازو سہلایا۔ گویا انہیں ابا کے زندہ ہونے کی خوشی سے زیادہ اپنے آنسوؤں کے ضائع ہونے کا غم ہوا تھا۔

"تا.... اب میں کیا اپنے سرہانے بینر لکھوا لوں کہ میں سو رہا ہوں، مرا نہیں۔ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔" ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

ہمارے ہاں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تو ابا خوشی سے اللہ کے حضور جھک گئے۔ مٹھائی بانٹی۔ میرے بیٹے کی ساتوں پھپھیاں ایک ایک ماشے کی سونے کی انگوٹھیاں لائیں اور بدلے میں آدھے آدھے تولے کے جھمکوں کی فرمائش کر دی۔ ابا تو سنتے ہی بھڑک اٹھے۔

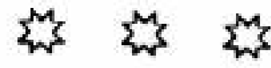
"تم لوگ اپنی لائی ہوئی مندریاں واپس لے جاؤ۔ تم لوگوں کے لیے دو ڈھائی لاکھ روپے کہاں سے لائے جائیں۔" ابا نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا مگر اماں اس دفعہ بیٹیوں کے ساتھ تھیں۔

"بھری پری سسرال میں رہتی ہیں۔ بھائی کے بیٹے کی ودائی تو بنتی ہے نا، آدھے تولے کی نا سہی، کچھ ہلکا پھلکا ہی سہی، پر سونے کی چیز ان لوگوں کا حق بنتی ہے۔" سو مرتے کیا نہ کرتے جیسے، تیسے پورا کیا گیا۔

جب میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو بڑی آپا نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا۔

"وے سرمد! جس طرح اماں کے گھر پہلے سات بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں پھر بیٹا تو مجھے لگتا ہے کہ اسی طرح تیرے گھر پہلے سات بیٹے ہوں گے پھر بیٹی۔ اس لیے بچوں میں زیادہ وقفہ نہ رکھنا۔"

یہ سن کر نادیہ سچ میں بے ہوش ہو گئی۔ آپا کی بات سے ڈر کر جو اس نے فل اسٹاپ لگایا تو نندوں کے طعنوں اور اماں کی نصیحتوں کے باوجود "بچے دو ہی اچھے" کی پالیسی پر کاربند رہی اور ہمیشہ کی طرح ابا کی سپورٹ تو اسے حاصل تھی ہی۔



میں اسی طرح اپنی بہنوں سے درگت بنواتا رہا اور میرے بیٹے موسیٰ اور ہارون اپنے تعلیمی مدارج طے کرتے رہے۔ جب میرے دونوں بیٹے آگے پیچھے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو میری آپائیں جو میری درگت بناتے وقت پکی اتحادی ہوتی تھیں ان میں پھوٹ پڑنا شروع ہو گئی۔

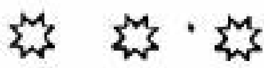
وجہ تھی میرے بیٹے۔

"جی... آپ ٹھیک سمجھے، میری ہر بہن یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے بیٹوں کے لیے اس کی بیٹی لوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میری سب بہنیں مجھ سے بڑی ہیں تو ان کی بیٹیاں میرے بیٹوں کی ہم عمر کیسے ہو گئیں۔ تو اطلاعاً عرض ہے کہ میری ہر آپا کے بچوں کی تعداد سات سے آٹھ عدد ہے۔ لہٰذا ان کے آخری دو دو بچے میرے بیٹوں کے ہم عمر یا ان سے تھوڑے چھوٹے تھے۔

لہٰذا اب ہر کسی کی یہ کوشش تھی کہ وہ میرے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اس چکر میں وہ ایک دوسری کی دو دو برائیاں بیان کرتیں کہ میں گنگ ہو جاتا۔ وہ سب شاید یہ بات بھول گئی تھیں کہ ہمارے ابا ابھی زندہ ہیں، جنہوں نے کبھی میرے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دی تو میرے بیٹوں کے ساتھ بھلا کیسے ہونے دیں گے؟ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہتا۔

میں اپنے بیٹوں کے لیے سب سے پہلے اپنی بھانجیوں کے بارے میں ہی سوچتا' آخر بہنوں کا بھائیوں پر بہت حق ہوتا ہے مگر بات دراصل یہ تھی کہ ان سب کی بیٹیاں ایک سے بڑھ کر ایک شوخیاں اور زبان دراز تھیں۔ روپیٹ کر میٹرک' ایف اے کیا اور سمجھو تعلیم مکمل۔ باقی کا سارا وقت گھریلو سیاستوں اور چغل خوری میں گزرتا۔ میری آپاؤں کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹیاں اپنی چنڈال پھوپھیوں پر گئی ہیں اور ان کی نندوں کے خیال میں پوری کی پوری اپنی ماؤں پر پڑی تھیں۔ ایسے موقع پر میری بہنوں کی نندیں پنجابی کی یہ کہاوت با آواز بلند دہراتی تھیں۔ "کنک دا بی تے ماں اتے دھی" (جیسی ماں ویسی بیٹی)

شکر ہے رب تعالیٰ کا کہ میرے بیٹے مجھ پر نہیں بلکہ اپنے دادا پر پڑے تھے۔ معاملہ فہم اور نڈر۔ جب میری بہنوں کا تقاضا حد سے بڑھنے لگا تو ابا نے اپنے پوتوں کے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ کی، جس کے بارے میں مجھے بہت بعد میں خبر ہوئی۔



اچانک میرے بیٹوں کی محبت اپنی پھوپھیوں کے ساتھ دن بدن بڑھنے لگی۔ وہ ان کے ساتھ رازداری سے کھسر پھسر کرتے۔ میں یا نادیہ جاتے تو خاموش ہو جاتے۔ یہ صورت حال مجھے اور نادیہ کو ہولانے لگی۔

"سرمد! اپنے بیٹوں کو کنٹرول کرو۔ اگر انہوں نے اپنی کسی پھوپھی زاد کو پسند کر لیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ آنسو پونچھتی اور میں خاموش رہتا اور دل ہی دل میں نادیہ سے کہتا کہ اگر ایسا ہو گیا تو اسے اپنی جان دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپاؤں کی راج دلاریوں نے اس کی جان خود ہی نکال لینی تھی۔ میں اور نادیہ جل جل کر خاک ہو رہے تھے اور ابا کا اطمینان دیدنی تھا۔

مجھے حیرت کا شدید ترین جھٹکا بلکہ جھٹکے تب لگنا شروع ہوئے جب چھ ماہ بعد باری باری بڑی تینوں بہنوں نے اپنی ان بیٹیوں کی منگنیاں اپنی سسرال میں

کردیں بجن کے لیے وہ موسیٰ اور ہارون کو داماد کی حیثیت سے پسند کر چکی تھیں۔ اس کے بعد باقی چاروں بھی بہانے سے سنا گئیں کہ وہ بھی عن قریب اپنی بیٹیوں کی بات اپنے سسرالی رشتہ داروں میں پکی کردیں گی۔ میں جو اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان تھا اس کایا پلٹ پر حیران رہ گیا۔

"اباجی! یہ آپاؤں کو کیا ہوا؟"

ہم سب رات کو اکٹھے بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ اماں جلدی سونے کی عادی تھیں، سو وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

"تو ساری عمر لگا رہتا تو بھی اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا تھا اور میں تیرے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ میرے دونوں شیر بالکل مجھ پر گئے ہیں۔ ان سے پوچھ لینا، میں سونے جا رہا ہوں۔" ابا نے موسیٰ اور ہارون کے کندھوں کو تھپکی دی۔

"بابا!" دونوں نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

"اف! بہت ایکٹنگ کرنا پڑی ہم دونوں کو۔" موسیٰ مسکرا رہا تھا۔

"حالانکہ آپ اور امی ہم سے ناراض رہنے لگے تھے کہ کہیں ہم پھوپھیوں کے داماد نہ بن جائیں۔" ہارون ماں کے برابر جا بیٹھا۔

"مگر یہ سب ہوا کیسے؟" نادیہ ابھی تک حیران تھی۔

"دادا نے یہ مشن ہم دونوں کے سپرد کیا تھا۔ سو ہم نے پلان بنایا۔ جب بھی کوئی پھپھی یہاں آتیں ہم ان سے خوب محبت جتاتے اور ان سے کہتے، پھپھو آپ اتنی اچھی ہیں۔ ہمارا بس چلے تو آپ کی بیٹی سے شادی کریں، مگر آپ ہماری امی کو تو جانتی ہیں نا، اول تو وہ مانیں گی نہیں اور مان بھی گئیں تو آپ کی بیٹیوں پر ظلم ڈھا کر آپ سے بدلے لیں گی اور آپ تڑپ تڑپ کر ختم ہو جائیں گی اور دادا کو بھی آپ جانتی ہیں وہ تو شروع سے امی کی ہی سائیڈ لیتے ہیں۔ وہ سر ہلانے لگتیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔" موسیٰ سانس لینے کو رکا تو ہارون شروع ہو گیا۔

"ریحانہ اور عالیہ پھپھو سے ہم نے کہا کہ آپ یقین کریں ہم نے خود سنا، وہ امی سے کہہ رہے تھے کہ عالیہ اور ریحانہ کی بیٹیوں سے شادی کروا کر وہ ان کے باپوں سے بدلہ لیں گے جو ان کا ادھار لے کر کھا چکے ہیں۔ "میں ابھی ابا سے بات کرتی ہوں۔" میری بات پر ریحانہ پھپھو اٹھنے لگیں تو موسیٰ نے پکڑ کر بٹھا لیا اور کہنے لگا۔ کیا کرتی ہیں پھپھو آپ نے یہ سب ان سے پوچھا تو پھر وہ ہمارا آپ سے ملنا بند کر دیں گے اور پھر آپ کو اندر کی خبریں ملنا بند ہو جائیں گی۔" ہارون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ "اس طرح کی برین واشنگ کر کر کے ہم نے یہ کام کروایا ہے۔" دونوں نے کالر اکڑائے۔

"پر بیٹا! وہ میری بہنیں ہیں، تم لوگوں کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ آخر میں ان کا اکلوتا بھائی تھا۔

"ہم جانتے ہیں بھائی، بہنوں کا مان ہوتے ہیں لیکن اس مان کے نام پر بھائیوں کی کھال تو نہیں کھینچنی چاہیے نا۔ اپنے حق کا شور مچانے کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔" موسیٰ اور ہارون نے تسلی دینے کے انداز میں میرے ہاتھ دبائے۔

"بابا! آپ پریشان نہ ہوں۔ اب ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اب کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" ہارون نے لاڈ سے کہا۔

"اور نہ ہی اب کوئی آپ کے کان کھینچ کر لمبے کر سکتا ہے۔" نادیہ نے لقمہ دیا تو سب کا بلند قہقہہ پڑا۔

اباجی ہمیشہ کہتے تھے کہ میرا پتر اکیلا ہے اور اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی، اس لیے میں ہر معاملے میں اپنے پتر کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور اب اباجی نے میرا ساتھ دینے کے لیے اپنے دونوں پوتوں کو تیار کر دیا تھا۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ دادا کے تربیت یافتہ دونوں پوتے میرے دائیں بائیں یوں سہارا بن کر کھڑے تھے کہ مجھے لگا میرا اکلوتا پن ہمیشہ کے لیے کہیں جا چھپا ہے۔

☆

لبنیٰ جدون

حصارِ دعا

وہ گھر، ماں باپ اور دولت سب کچھ چھوڑ آیا۔ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کے جگہ جگہ لاوارثوں کی طرح پڑا رہنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ وہ دعا کی طرح مٹی ہو جانا چاہتا تھا۔ اس مٹی میں ہی رُل جانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ اپنی دعا کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکا تھا۔

اس کا ہارا ہوا وجود تھا اور ایک ایسا سفر تھا جس کی کوئی منزل نہ تھی اور نہ ہی کچھ حاصل۔ بے سمت راستوں کا راہی بن گیا۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے کوئی پروا نہ کی کہ اب اسے اس زندگی کی خواہش ہی کب تھی۔

پھر نجانے کیسے اس نڈھال وجود میں اتنی طاقت آ گئی کہ اس نے بھاگتے ہوئے ایک حملہ آور کو پکڑ لیا۔ پولیس بھی وہاں پہنچ گئی اور انہیں گرفتار کر لیا۔ سیٹھ ارمغانی نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر وہ نقاہت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔

شام کو سیٹھ ارمغانی اسے دیکھنے اسپتال آئے تو اس کے متعلق جاننا چاہا مگر اس کے لب چپ کے قفل نہ توڑ سکے۔

"تم بتاؤ زین! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

پہلی بار اس نے منہ کھولا کہ اسے ایک وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے نوکری چاہیے۔ سیٹھ ارمغانی نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ایک ہی دفعہ نہیں مرنا چاہتا تھا بلکہ قطرہ قطرہ زہر اپنے وجود میں اتارنا چاہتا تھا۔ اپنے ہی وجود پہ سانسیں تنگ کرنا چاہتا تھا۔

رات وہ ایک ہوٹل پر روکھی سوکھی کھا کر بان کی تنگی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تب دعا حساب کتاب لینے آ جاتی۔ وہ اسے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتا مگر ہر روز وہ اس سے ناراض چلی جاتی اور بان کی چارپائی کانٹوں کا بستر بن جاتی۔ اس کے نوکیلے کانٹے ساری رات اس کے وجود کو لہولہو کرتے اور وہ روتے روتے سوچتا نجانے کب نیند اسے اس اذیت سے چھٹکارا دلائے گی۔ مگر



ناولٹ



سوتے ہی ماضی بھیانک انداز میں سامنے آجاتا تھا۔ ایک ایک جملہ ایک ایک مرحلہ ایک ایک لمحہ حساب لیتا تھا۔ ماضی... اے میرے ماضی... مجھے اپنی اذیت سے آزاد کر دے... میرا دامن چھوڑ دے... وہ چلاتا مگر... بے سود...



وہ بھی روایتی سی کہانی کا روایتی کردار تھا۔ سوتیلے رشتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ وہ اس آگ کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کب تک اس آگ پر پانی ڈال ڈال کر بجھاتا۔ وہ تنہا اس آگ کو نہیں بجھا سکتا تھا۔

سکندر ہمیشہ اس سے مقابلے پر رہتا تھا۔ سوتیلی ماں نے قدم قدم پر اپنا زہریلا رنگ دکھا کر ثابت کر دیا کہ وہ زین کی سوتیلی ماں تھیں۔ جن کی وجہ سے اس کی اماں تڑپ تڑپ کر قبر میں اتر گئیں۔

زین نے ایک ایک دن اذیت میں کاٹا۔ کوئی من پسند چیز اس کے ہاتھ میں سکندر نہ رہنے دیتا۔ وہ اس کا جھکا سر دیکھ کر فاتحانہ انداز میں قہقہے لگاتا تو زین کا دل چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جائے مگر کہاں... جان نہ پاتا۔ لیکن اب کے وہ جو چھیننا چاہتا تھا' وہ زین کی متاع حیات تھی۔ اس کے لیے اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا۔

"زین! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ کچلے جاؤ گے۔" سکندر بدلحاظی سے اس کے سامنے آکے بولا۔

زین حیرت سے اسے دیکھنے لگا اس نے کسی اور کی محبت میں خود دعا سے منگنی ختم کی تھی۔ لیکن یہ جاننے کے بعد کہ دعا اور زین ایک دوسرے سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں تو سکندر کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے زین نے جبراً ان دونوں کو جدا کیا ہو۔

دعا تو نجانے کب سے زین کی محبت میں گرفتار تھی' لیکن ماں کے فیصلے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے سکندر کے لیے رضامندی دے دی تھی۔ اب جب رب نے ان دونوں کو نواز ہی دیا تھا تو کیسے منہ موڑ لیتے... لیکن

اب سکندر اس بگڑے بچے کی طرح ہو گیا تھا جو اپنا پھینکا ہوا کھلونا کسی کے ہاتھ میں دیکھ کر چھین لیتا ہے۔

"جاؤ... چلے جاؤ یہاں سے۔ دعا کوئی میرے نام کی جانے والی جائیداد نہیں ہے۔ جو تم یہ قربان کر دوں۔" زین نے سختی سے کہا تو وہ چنگھاڑنے لگا۔

"تم جانتے نہیں ہو زین مجھے... میں چھین لیتا ہوں... مجھ سے مت ٹکراؤ' کرچی کرچی ہو کے یوں بکھرو گے کہ ساری عمر سمیٹنے میں گزر جائے گی۔ یہ ریت کے گھروندے سمندر کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے زین ابتسام!" وہ اس کے سامنے آکے بولا۔ اس کا انداز گفتگو ہمیشہ سے جارحانہ تھا۔ زین البتہ بہت محتاط رہتا تھا۔

ان کے درمیان زر کا مسئلہ تھا اور نہ زمین سانجھی تھی کہ ابا نے سکندر اور زین کے حصے کی جائیداد ان کے نام کر دی تھی۔ اماں کو اعتراض تو ہوا مگر وہ کچھ نہ کر سکیں۔ وجو زن وجہ فساد بننے چلا تھا۔

"یہ گھٹیا پن کی انتہا ہے سکندر... میری اور اس کی شادی ہونے والی ہے۔" یہ وہ واحد مقام تھا جہاں زین نے بھی ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ حالانکہ وہ اس مزاج کا نہ تھا۔

"وہ بہت بڑی غلطی کر رہی ہے... تم میں ہے ہی کیا پسند کیے جانے والا... ایک بزدل اور ڈرپوک شخص۔ دیکھ لینا زین ابتسام! میں اس بار بھی تم سے وہ چھین لوں گا جو تمہیں چاہیے۔" سکندر نے اس کی صلح جو فطرت کا تمسخر اڑایا۔

زین چپ چاپ وہاں سے نکل گیا سکندر کا قہقہہ دور تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اور اگلے دن روتے ہوئے دعا اس کے پاس آئی اور اچانک ہی اس کے ساتھ آن لگی حالانکہ دونوں کے درمیان محبت ہونے کے باوجود ایک حد تھی۔

"دعا... تم ٹھیک تو ہو نا... پلیز بتاؤ ہوا کیا ہے۔" وہ گھبرا گیا۔

"زین! اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ پلیز... مجھے لگتا ہے تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ سکندر کی فطرت' اس

کی کمینگی تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔" اس کا نازک سا وجود زین کے بازوؤں میں ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔
"سکندر کو دیکھو۔ وہ کتنی ذلالت پر اتر آیا ہے۔"

"دعا۔۔۔ تم پلیز اسے اگنور کر دیا کرو۔ اس کے منہ بالکل نہ لگنا کہنے دو اسے بکواس۔ جلد ہی نکاح کر لوں گا۔ پلیز اس وقت اس سے قطعاً مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا میری خاطر۔۔۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"زین! وہ بہت تنگ کرتا ہے۔" اس کی بھیگی بھیگی آواز زین کو تڑپا گئی۔

"تھوڑی برداشت کا مظاہرہ کرو میری خاطر۔۔۔ ہم شادی کے فوراً بعد اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے۔" وہ اسے کرسی پہ بٹھاتے ہوئے بولا۔

"اور کوشش کرنا کہ تمہارا اس سے سامنا نہ ہو، کیونکہ انسان انسانیت کی حدوں سے نکل جاتا ہے تو وہ انسان نہیں رہتا اور نہ ہی اس کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت رہتی ہے۔"

"تو پھر۔۔۔ کیا ہوگا زین؟" آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔۔۔ چلو آؤ۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔" جونہی وہ کمرے سے نکلے، سکندر نے راستہ روک لیا۔

"اوہ۔۔۔ آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" وہ دعا کے گرد چکر لگاتے ہوئے خباثت سے مسکرایا۔

"چلو دعا۔۔۔" زین اسے لے کے آگے بڑھنے لگا تو پھر وہ سامنے آ گیا۔ زین نے دعا کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ ڈر رہی تھی۔ وہ حریص نظروں سے دعا کو دیکھنے لگا۔

"سکندر! اتنا مت گرو کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے۔"

"کتنی شرافت سے میں تم سے دعا کو مانگ رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو۔۔۔" وہ بے غیرتی کی آخری حدوں پر تھا۔

"تم بھائی کی خاطر اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے۔ بھائی پر ایک لڑکی کو ترجیح دے رہے ہو۔ کیا یہی تمہاری اماں نے سکھایا ہے۔" وہ جانتا تھا کہ ماں کے نام لیتے ہی وہ بھڑک اٹھتا تھا۔

"انہوں نے مجھے جو سکھایا ہے، اسی وجہ سے میں اب تک تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔" زین نے دعا کا ہاتھ تھاما اور جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔

"دعا پلیز۔ خود کو سنبھالو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جانور ہے۔ وحشی درندہ ہے۔ یہ کچھ بھی کر سکتا ہے، کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

"اچھا میں تائی اماں سے بات کرتا ہوں تاکہ کم از کم نکاح پہلے ہو جائے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔" زین نے کہا۔ تو وہ چپ ہو گئی۔

اسی شام زین نے ابتسام انیس سے تمام حالات گوش گزار کیے۔ وہ پریشان ہو گئے۔ حرکتیں تو وہ بھی اس کی دیکھ رہے تھے۔ انتہائی بدلحاظ اور بدتمیز ہو گیا تھا۔ ان سے بھی بدتمیزی کر جاتا۔

زین نے انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ اس کے نوٹس میں لائے بغیر وہ دونوں نکاح کر لیں اور رخصتی کے بعد وہ دونوں ملک ہی چھوڑ جائیں گے۔ انہوں نے اسی وقت ہی امریکا فون ملایا اور بھائی جان سے بات کی۔

خفیہ طور پہ سب طے کیا گیا اور تین دنوں کے اندر ہی نکاح ہو گیا۔ بھائی جان نے ایک ہفتے کے اندر آنے کا وعدہ کیا۔

"ابو۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ آپ کی وجہ سے مجھے زندگی میں پہلی خوشی ملی ہے۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی باپ سے شکوہ کر ہی ڈالا۔

"بہت شرمندہ ہوں تم سے میرے بچے۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ میں۔۔۔ اپنی ناانصافی کی سزا سکندر کی صورت بھگت رہا ہوں۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

زین خاموش ہو گیا۔



اس پر نظر ڈالنے سے پہلے وہ اس رب کے سامنے جھک گیا جس نے یوں نوازا تھا کہ پورا وجود ایک ترنگ میں آگیا تھا۔

وہ خواب آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے اسے دیکھ رہا تھا۔ سرخ خوب صورت جوڑے میں وہ زین کے جذبوں کی طرح دہک رہی تھی۔

عجب سرور کی سی کیفیت تھی۔ اتنی آسانی سے محبت مل گئی۔ زندگی اس قدر خوب صورت ہو گئی۔

جذبات سے بوجھل ہو کر زین نے اس کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ مرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ باہر ایک شور سا مچ گیا تھا۔ زین گھبرا گیا۔

دعا فوراً" بیڈ سے اٹھی۔

"کون..." زین نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تو سامنے سکندر کے ساتھ چہرے ڈھانپے تین بندے تھے، جو اسے دھکا دیتے ہوئے اندر آگئے۔ زین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا انہوں نے زین کو پکڑ لیا۔

"سکندر... رک جاؤ... سکندر خدا کے لیے... رک جاؤ۔" زین دھاڑ رہا تھا مگر اتنی دیر میں شیطان اپنا کھیل کھیل چکے تھے۔

لحموں میں سکندر نے تیزاب کی پوری بوتل دعا پہ انڈیل دی تھی۔

"کہا تھا تمہیں کہ یہ سرخ جوڑا نہیں پہنے گی۔ تم نہیں سمجھے میری بات... تمہاری وجہ سے اس کی زندگی گئی۔"

وہ اپنا مکروہ کھیل کھیل کر تیزی سے نکل گئے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔

زین خود کو چھڑانے میں ناکام ہو گیا تو تڑپ تڑپ کر رونے لگا تھا۔

چھوٹی ماں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ابا جان یوں بے بسی سے بیٹھے تھے کہ جیسے فریاد کر رہے ہوں اللہ کے نام پر... میرا گھر... میرے بچے... میری دعا... اللہ اے اللہ...

وہ شیطان اپنا کام کر کے بھاگ گئے تو زین دعا کو بازوؤں میں اٹھا کر پاگلوں کی طرح اسپتال پہنچا مگر وہ چلی گئی۔ کوئی بھی شکوہ گلہ کیے بغیر۔

ایک طوفان زین کی زندگی میں آیا اور ایک قیامت تائی اماں کے اوپر ٹوٹی تھی۔ اکلوتی اولاد کی موت قیامت سے کم تھی؟

زین چپ چاپ دعا کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس کا چہرہ تو سامنے نہ تھا مگر ایک سفید چادر میں اس کے ہونے کا احساس تھا۔

اس ظالم نے زین سے، اس کی دعا کو آخر چھین ہی لیا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ چھوٹی ماں آگے بڑھیں تو اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ابو نے صرف بے بسی سے دیکھا۔ سب کچھ تو انہیں کا لٹا تھا۔

اگلے دن پولیس نے مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر سکندر کو ایک دوست کے گھر سے گرفتار کر لیا۔



وقت نے تو بہرحال گزرنا تھا۔ وہ کیا جانے کہ کس کا کیا کیا لٹ گیا تھا۔

طوفان آکر گزر گیا۔ پیچھے کیا تباہی ہوئی۔ کس کس کا جہان لٹ گیا۔ کون بین کر رہا تھا... کس کی ممتا تڑپ رہی تھی۔ دکھ، درد... مایوسی... حزن و ملال اور اداسی کے اس کھیل میں وقت نے اپنی دوڑ لگائی ہوئی تھی۔ آنسو آنکھوں سے رواں تھے اور وقت اپنی رفتار کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

ایک... دو... تین... بارہ... چوبیس... اور پھر چالیسواں... دنیا والوں نے اپنی ساری رسومات ختم کر دیں۔

تایا جان نے اپنی واپسی کی فلائٹ بک کروالی۔ اس بار بھی وہ تنہا ہی جا رہے تھے۔ زین ان کی طرف آگیا۔

"تایا جان...!"

"ہوں..." ان کی آواز کا بھیگا پن زین سے چھپا نہ رہا۔

"تایا جان! آپ واپس جا رہے ہیں؟"

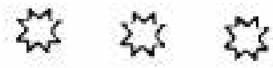
"اب یہاں میرے لیے بچا ہی کیا ہے۔" وہ ہارے

ہوئے لہجے میں بولے۔
"تائی اماں بالکل تنہا ہو گئی ہیں۔۔۔ کیسے رہیں گی وہ اب۔۔۔ کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔۔۔؟"
"نہیں۔۔۔ جب تک اس احساس گناہ سے آزاد نہیں ہو جاتا کہ میری وجہ سے ایک آباد گھر اجڑا تھا۔ ایک معصوم دودھ پیتی بچی کو ماں کی ممتا سے میری وجہ سے دور ہونا پڑا۔" وہ چلا اٹھے۔
"معاف نہیں کر سکتے کیا آپ۔۔۔ دکھ کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کے دکھ کے ساتھی بن جائیں۔ تکلیف کا احساس کم ہو جائے گا۔"
"نہیں زین۔۔۔ ہم دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے، اس بات کا اندازہ مجھے دعا کی پیدائش کے کچھ دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے دھوکا کھایا تھا۔ وہ جھوٹ کے ساتھ میری زندگی میں آئی تھی، صرف دولت کی ہوس میں۔۔۔ ممتا جیسے جذبے کی تذلیل کر کے۔۔۔ میں نے اسے دولت دے دی۔ اس سے زیادہ کی نہ اس کی خواہش تھی اور نہ طلب۔۔۔ اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں اولاد جیسی نعمت کبھی اس کی گود میں نہ ڈالتا۔ دیکھ لیا تم نے۔۔۔ کیا ہوا میری اولاد کا انجام۔۔۔ دیکھ تم نے۔۔۔ بدقسمت عورت۔۔۔ خود بھی نامراد رہی اور مجھے بھی بے سکون رکھا۔ کاٹے اب اس اذیت بھری زندگی کو۔۔۔" وہ سختی سے بولے، پھر وہ نہیں رکے۔
تایا جان کے جانے کے بعد وہ ان کی طرف آیا تو وہ تنہا بیٹھی گہری سوچوں میں گم تھیں۔
"تائی اماں۔ بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ آپ کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اس درندے کو پہچانتے ہوئے بھی اس کا اعتبار کر بیٹھا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر رو پڑا۔
"زین۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ میرے رب نے۔۔۔ تو کیا جانے کس پکڑ میں مجھے یہ سزا دی ہے۔ نہ تیرا قصور تھا۔۔۔ نہ میری بچی دعا کا۔۔۔ قصوروار تو صرف میں تھی۔۔۔ یہ میری سزا ہے۔ اللہ تیرے زخم کا مداوا کرے۔ میرے زخموں کا کوئی مرہم نہیں ہے۔ میں

نے خود اپنی دعا ٹھکرادی تھی پھر کیسے توقع کرتی کہ رب پھر مجھے نوازدے گا۔"

وہ کھوئی کھوئی بول رہی تھیں۔ دعا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی موت اور موت بھی ایسی کہ ایک زمانہ رو دے۔ ماں دیوانی نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

ہر ٹی وی چینل پر اس کی خبر چلی تھی۔ اعلا حکام نے بھی اس خبر کا نوٹس لے لیا تھا۔ اس کا مقدمہ سپیڈی کورٹ میں چلائے جانے کا حکم تھا۔



زین کے اندر عجیب سی وحشت نے بسیرے ڈال دیے تھے۔ ابا جان صدیوں کے مریض بن گئے۔ چھوٹی ماں اس سے نظریں نہیں ملاتی تھیں۔ وہ خود بھی فاصلے پر رہتا تھا۔ وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر دعا سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ وہ ہر تاریخ پر عدالت جاتا۔ ہر بار سکندر کا پیغام ملتا کہ ایک بار زین اس سے مل لے، مگر اب وہ اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اب اس کے پاس کھونے کو کچھ نہ بچا تھا مگر دعا کی ---- موت کا وہ بدلہ ضرور لینا چاہتا تھا۔

چھ ماہ کے اندر مقدمہ اپنے انجام کو پہنچا اور سکندر کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

اب اس کی زندگی کی آخری امید زین تھا۔ ہر طرف سے اس کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ صدر نے بھی سزا کا حکم بحال رکھا۔ جس صبح اسے پھانسی ہونی تھی۔ اس رات چھوٹی ماں جھولی پھیلائے اس کے سامنے آئیں۔

"زین.... جھولی پھیلا کر تم سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ میں جانتی ہوں اس کا جرم ناقابل معافی ہے مگر میں ماں ہوں۔ میرا دل کٹ رہا ہے۔ میرے کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں۔"

"وہ بھی تو ماں ہی تھی جس نے اپنی بیٹی کو کتنے ارمانوں کے ساتھ سرخ جوڑے میں رخصت کیا تھا۔ اس کی اذیت کا اندازہ ہے آپ کو.... کوئی ازالہ ہے اس کے دکھوں کا؟" وہ زخمی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو اس ماں سے جاکر بھیک مانگیں، جس نے سہاگ کے جوڑے میں اپنی بیٹی کا جھلسا ہوا وجود دیکھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ رشتوں کے جنگل میں پھنس کر کمزور پڑجاؤں گا تو وہ کم از کم اپنی بیٹی کا مسخ چہرہ نہیں بھولیں گی۔"

چھوٹی ماں مایوس لوٹ گئیں۔

وہ رات بہت بھاری تھی۔ وقت لمحہ لمحہ بھڑکتی آگ کی مانند اسے جھلسا جھلسا کر گزر رہا تھا۔ وہ رات بہت طویل تھی۔ گزرکے نہ دے رہی تھی۔

ابا جان ---- چھوٹی ماں اور زین ابتسام پر قیامت کا وقت تھا۔

فجر کی اذان کی آواز کانوں میں گونجی تو چھوٹی ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ماں کی فریادیں آسمانوں کو چھونے لگیں۔ ان کی چیخیں زین کے دل میں لگ رہی تھیں۔

زین بے چین ہو کر گھر سے نکل آیا۔

آنسو یوں رواں ہوئے کہ اسے لگا وہ ان میں بہہ جائے گا۔ کاش وہ بوڑھے ماں باپ کو اس کھو دینے کی اذیت سے بچالیتا، جس سے وہ گزرا تھا۔

بہت دیر بعد پتا نہیں کہاں کہاں گھوم کر وہ مردہ قدموں سے واپس آیا تو منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

میت کے سامنے چھوٹی ماں رو رہی تھیں۔ سفید چادر میں لپٹا بے بس وجود دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

ابا جان کی نظر زین پر پڑی تو لڑکھڑاتے ہوئے اس کی جانب بڑھے۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"جو کچھ ہوا وہ عین انصاف ہے مگر کیا کروں کہ میں اور بے چین ہو گیا ہوں۔ مجھ سے سکندر کا یہ روپ دیکھا نہیں جا رہا۔ میں.... ایک دفعہ پھر میں ہی ہارا ہوں۔" وہ وہیں میت کے پاس بیٹھ گئے۔

چھوٹی ماں کے بین جاری تھے۔ اس نے محسوس

کیا۔ وہ خود بھی رو رہا ہے۔

کیا فائح ایسے ہوتے ہیں۔ بکھرے اور ٹوٹے ہوئے۔۔۔

زین جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا مگر دل مضطرب۔ کا کیا کرتا۔ جواب بھی پرسکون نہیں تھا۔

سکندر والے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تو کئی مواقعوں پر بولے جانے والے اس کے تلخ جملے کانوں میں گونجنے لگے۔

وہ تو غرور کی اونچی مسند پر بیٹھ کے اسے اپنے قدموں کی خاک کہتا تھا آج خود ہی خاک کا ڈھیر بن گیا تھا۔

اس دشت کی سیاحی میں چھ ماہ گزر گئے۔ موبائل نمبر بدل لیا' اپنی حالت بدل لی' زندگی بدل لی تاکہ کوئی اسے نہ پہچان سکے۔ وہ اپنی شناخت سمیت کھو جائے۔



اچانک' صورت حال بدل گئی۔ وہ جو کسی کی محبت میں تڑپ رہا تھا' کوئی اس کی محبت میں تڑپنے لگا۔ اسے حیرت تھی کہ اس حلیہ میں بھی اس پر کسی کا دل آسکتا ہے۔

عام سا شکن زدہ کئی بار کا دھلا ہوا لباس۔۔۔ کئی دنوں بعد یاد آتا تو شیو بنا لیتا' ورنہ کوئی فکر بھی نہ ہوتی۔ سیٹھ ارمغانی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جس کا وہ ڈرائیور تھا۔ اسے یونیورسٹی لاتا لے جاتا تھا۔ اس کے بدلے بدلے تیور وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ صاف صاف اظہار پر اتر آئی تھی۔

"پلیز زین۔۔۔ کیوں نہیں سمجھتے ہو تم۔۔۔" سحر نے بے بسی سے اس پتھر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

مگر زین انتہائی پرسکون انداز میں ڈرائیونگ کرتا رہا جیسے ان دونوں کے علاوہ بھی گاڑی میں کوئی تیسرا موجود ہو جس سے سحر مخاطب ہو۔

"زین۔۔۔" سحر کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اسے کندھے سے پکڑ کے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھٹکا لگنے سے گاڑی لہرا کے فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ سحر گھبرا گئی۔ زین نے جھٹکے سے سر گھما کر اسے دیکھا۔

"زین سوری۔۔۔" وہ رو دینے والی ہو رہی تھی۔

"تمہارے حق میں بہتر ہے کہ چپ رہو' ورنہ میں یہیں گاڑی چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔" وہ دہاڑا۔

سحر خاموش ہو گئی کہ اس سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ایسا کر بھی گزرتا۔ وہ شرمندگی سے رو پڑی۔

"میں آخری دفعہ تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم پتھر سے سر پھوڑ رہی ہو۔ تمہاری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔" وہ پتھریلے لہجے میں بولا۔

"کچھ احساس ہے تمہیں کہ تم کس کی محبت کو ٹھکرا رہے ہو۔ میں سیٹھ ارمغانی کی بیٹی۔۔۔ ان کی ساری جائیداد کی اکلوتی وارث۔۔۔ سب کچھ میرا ہے۔۔۔ اور میں۔۔۔"

"محترمہ! ایک بات یاد رکھیے گا تمہارے باپ کی بے پناہ دولت اور تمہاری یہ خوبصورتی میرے لیے بے وقعت ہے۔ میری زندگی میں دولت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ تم نہیں جانتیں میں کون ہوں۔ سو اپنے کام سے کام رکھا کرو۔" اس نے نہایت سرد مہری سے کہا۔

"زین۔۔۔" سحر کی آواز گلے ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔

"میں اس سے زیادہ نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سننا چاہتا ہوں۔" وہ ہاتھ اٹھا کے بولا اور جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرکے ریورس گیئر میں ڈال دی۔

سحر اس کے بعد لب بھی نہ کھول سکی۔ ہوش اس کی آواز پہ آیا۔

"اتریں۔۔۔" سر اٹھایا تو گاڑی گھر کے وسیع و عریض کار پورچ میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے اسے اپنی حیثیت سے آگاہ کرنے والا گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

وہ مردہ قدموں سے اتری اور گھر کے اندر بڑھ گئی۔

وہ وہاں سے سیدھا سیٹھ ارمغانی کے آفس آگیا۔

گاڑی کی چابیاں ان کے سامنے میز پہ رکھ دیں۔

"سر! میں ذہنی طور پہ اس قابل نہیں کہ ڈرائیونگ کر سکوں۔"

"تم نے خود ہی آفس جاب سے انکار کیا تھا ورنہ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم اپنے معیار کا کام کرو۔۔۔ تمہارے پاس اتنی ڈگریاں ہیں۔" انہوں نے کہا۔

زین خاموش رہا۔ سیٹھ صاحب جانتے تھے وہ آفس میں کام نہیں کرنا چاہتا وہ تقریباً "روز ہی اس سے اصرار کرتے تھے مگر پتا نہیں کیوں وہ ٹال دیتا تھا۔ اب بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اتنا ضرور وہ جانتے تھے کہ کوئی کرب ہے۔۔۔ جو اندر اندر ہی اسے کاٹتا رہتا ہے۔

"زین۔۔۔ تم یہاں آفس میرے ساتھ آجاؤ اور بی بی کے ساتھ میں اختر کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔" کچھ دیر بعد سیٹھ ارمغانی نے دھیرے سے کہا تو اس نے مزید سر جھکا لیا گویا سے ان کا یہ فیصلہ منظور تھا۔

لیکن اگلے دن جب اختر یونیورسٹی سے سحر کو لینے گیا تو تنتناتی ہوئی باپ کے۔۔۔ آفس چلی آئی۔

"ارے بیٹا۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔۔۔ کیوں اتنے غصے میں ہو۔" انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

"ڈیڈ! مجھے اختر کے ساتھ یونیورسٹی نہیں آنا۔" وہ اپنی بات پہ ڈٹی رہی۔

"بیٹا! زین اب راضی نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی ڈیڈ! میری گاڑی زین ہی ڈرائیو کرے گا۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں زین کو بلوا کے تمہارے سامنے ہی بات کرتا ہوں۔" انہوں نے انٹر کام پہ زین کو اندر بھیجنے کا کہا۔

زین کچھ دیر بعد اندر آیا۔ سیٹھ ارمغانی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"زین! سحر کی خواہش ہے کہ گاڑی تم ہی ڈرائیو کرو۔"

"سر! اپنی ذہنی حالت کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھا پاؤں گا۔۔۔ پلیز۔۔۔"

"زین دراصل اختر نے ایک دو دفعہ گاڑی مار دی تھی۔۔۔ اسی لیے سحر ڈر رہی ہے اس کے ساتھ۔۔۔"

"سر! آپ کوئی نیا ڈرائیور رکھ دیں ان کے لیے۔" زین نے بہترین مشورہ دیا۔

"ڈیڈ! ہر کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔" سحر نے کہا تو زین کا دل چاہا کہ اس کا سر توڑ دے۔

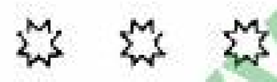
"ٹھیک ہے سر مگر ایک شرط پر۔۔۔" وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا۔۔۔؟" اس کی بات پر سحر کی دھڑکنوں کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

"آپ سحر بی بی سے کہہ دیں کہ وہ گاڑی میں خاموش بیٹھیں گی۔ یہ بہت بولتی ہیں۔ میں ڈسٹرب ہوتا رہتا ہوں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سحر کی شکایت کر دی۔ سیٹھ ارمغانی کچھ نہ سمجھے۔ مسکرا دیے مگر سحر اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر شرمندہ ہو گئی۔ کہنے کو تو زین نے کہہ دیا مگر اب اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ سحر کی شرمندگی دیکھ کر۔ اس نے سیٹھ ارمغانی کے ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔۔۔ گاڑی کی طرف بڑھا مگر سحر نے "سوری زین" کہہ کر چابی اختر کے حوالے کر دی۔

زین کو خوشی ہوئی کہ اسے سنبھلنے کا سلیقہ تھا۔

گاڑی گیٹ سے نکلی تو وہ بجھے دل سے اپنی سیٹ پر آ گیا۔



"انیس! مجھے امید ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔۔۔ اس سے معافی مانگے بنا تو مجھے موت بھی قبول نہیں۔"

چھوٹی ماں ایک بیٹے کی موت اور دوسرے کی جدائی میں تڑپنے لگیں۔ "کتنا ظلم کیا میں نے زین کے ساتھ' دعا کے ساتھ۔ کیا میرے لیے بخشش کا کوئی راستہ ہو گا۔۔۔" وہ سوال کرتیں اور کوئی جواب نہ پاتیں۔ کیونکہ بہت سے سوالات کے جوابات ان کے اپنے اندر ہی مل جاتے تھے۔

"پتا ہے انیس! مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی' جب سوتی ہوں یوں لگتا ہے جیسے تیزاب کی بارش میرے وجود پر برس رہی ہے۔۔۔ میں سو نہیں پاتی۔۔۔ مجھے بے

خوابی کا مرض لاحق ہوگیا ہے.... میں یوں ہی سسک سسک کر جی رہی ہوں.... میں تڑپ تڑپ کر مرنا چاہتی ہوں جیسے دعا تے تکلیف سہی۔ جو میرے لیے سکندر کی پھانسی کے پھندے سے کئی گنا زیادہ اذیت ناک ہے.... لیکن ایک بار زین مل جائے تو.... ہلکی سی امید ہے کہ شاید.... وہ مجھے معاف کردے...."

انیس ابا سام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مغرب کی نماز کو چل دیے۔ واپسی میں وہ زبردستی بھابھی کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر ان کی کوششوں سے پہلی دفعہ بھائی جان نے بھابھی سے فون پر بات کی۔

"میں نے آپ سے دھوکا کیا۔ مجھے معاف کردیں۔"

وہ رو پڑیں۔

"میں نے بہت سے لوگوں کی زندگی برباد کی.... آپ کی اپنی اور اس شخص کی جس نے میرے سہارے کھڑا ہونا چاہا.... اپنی اولاد کو جو عورت پھینک آئے.... اس کی زندگی میں مسرتوں کا کوئی حق نہیں ہوتا.... اسی لیے، تو مجھے میری دعا نصیب نہیں ہوئی۔"

"ایک دفعہ اپنی بیٹی کے پاس ضرور جانا معافی مانگنے...." ان کا اتنا کہنا تھا کہ سسکیاں روکنا ناممکن ہوگئیں۔

"میں آپ کی اجازت کی منتظر تھی...."

"اجازت ہے...." اور رابطہ ٹوٹ گیا۔



"سحر آئی ایم سوری...." گاڑی سیدھے روڈ پر ڈالتے ہوئے، اس نے بیک ویو مرر سے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ آج اختر چھٹی پر گیا تھا۔ سیٹھ ارمغانی میٹنگ میں تھے۔ انہوں نے اپنے پی اے کے ذریعے کسی کو سحر کو پک کرنے کا پیغام بھیجا تو زین نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور خود لینے چلا گیا۔

سحر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"سحر! یقین کرو کہ میں بہت چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا انسان ہوں.... مجھ سے اپنے ساتھ چلنے والے لوگوں کی خوشیاں سنبھالی نہیں جاتیں۔ تم تو اتنی نازک سی ہو کہ ایک کانٹے کی چبھن بھی نہ سہہ پاؤ۔" اس کی خاموشی کے باوجود وہ بولتا رہا کہ وہ جانتا تھا کہ اس سے تھوڑی زیادتی ہوگئی تھی۔

"سحر! میں نے کسی کو بہت شدت سے چاہا تھا۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ اس نے میرے لیے کیا تھا.... تم بہت اچھی ہو مگر مجھے اب کسی اور کی تمنا نہیں رہی۔"

اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو بے رحمی سے رگڑ ڈالا کہ آنسو اس کے دل کی کیفیت کا بھرم نہ توڑ ڈالیں۔

"میں آج بھی اس کی محبت کو اپنے وجود کا حکمران پاتا ہوں.... اس کی محبت نے مجھے سکھایا ہے کہ کسی کو تکلیف دینا محبت کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا۔ اسی لیے مجھے تمہیں ہرٹ کرکے افسوس ہو رہا ہے...." وہ چپ رہی۔ کافی دیر خاموشی رہی۔

"سحر...." زین نے چونک کر بیک ویو مرر میں دیکھا۔ پھر اس کے ہوش گم ہو گئے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔

"او مائی گاڈ...." وہ گھبرا گیا۔ اس نے سائیڈ میں گاڑی روکی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کے اسے پکارنے لگا۔ اس کے گال تھپتھپائے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو قریبی اسپتال لے آیا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور ایک ٹیسٹ لکھ کر دیا۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا مگر اچانک ڈاکٹر نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ ان فیکٹ شی از پریگننٹ...." ڈاکٹر صاحبہ مسکراتے ہوئے بتا کے چلی گئیں۔ زین کی حالت ابتر ہوگئی۔

"تو یہ تھی اپنے باپ کے غریب ملازم کو پٹانے کی وجہ.... تف...." اس نے غرا کر کہا۔

"زین...." اس نے بمشکل آواز نکالی۔

"بس...." اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے کچھ بھی بولنے سے روکا۔ سحر کی تو روح ہی تھرا اٹھی۔

"تم سونے کا چمچہ منہ میں لے کے پیدا ہوئیں۔۔۔ خوبصورت ہو۔۔۔ تم نے بار بار بتانے کی کوشش کی۔۔۔ کسی اور کو بھی بتایا ہوگا اور وصول بھی کیا۔۔۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔۔۔" وہ ڈاکٹر کی رپورٹ والا لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

"تم تو میری سوچ سے بھی بڑی چیز نکلیں۔ کمال بازی کھیلی جا ہی میرے ساتھ تم نے۔ واہ داد دینی پڑے گی مجھے تمہاری ذہانت کی۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

"زین یہ رپورٹ صحیح نہیں ہے۔" اس نے بولنے کے لیے بمشکل خود کو جمع کیا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔ بہرحال اب اٹھو۔۔ گھر جانا ہے۔" وہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

وہ بمشکل اٹھی اور باہر تک آئی۔ دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پہ بل ادا کر کے پلٹا تو آگے بڑھ کے اسے تھاما کہ وہ گرنے ہی والی تھی۔ انسانیت اور ارد گرد کے لوگوں کی نظروں کی وجہ سے بھی اسے تھامنا پڑا۔

"زین پلیز۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یقیناً ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔" راستے میں اس نے ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی۔

"پلیز چپ ہو جاؤ۔۔۔ مگر اتنا ضرور سوچو کہ تمہارے باپ کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ اسے کچھ لوگ اس شہر میں پہچانتے ہیں۔" زین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ لفظ چبا چبا کے بولا۔

گاڑی جب پورچ میں رکی تو سیٹھ ارمغانی نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے سحر اور زین کو آتے دیکھا۔ ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا۔

"اگر سحر کو زین اچھا لگتا ہے تو واقعی وہ اچھا بھی ہے۔ کیا برائی ہے اگر وہ سحر کا ساتھی بن جائے۔ سحر میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔ لیکن کیا وہ مان بھی جائے گا۔" یہ سوال انہیں الجھن میں ڈال گیا۔



"زین! میں اپنی بیٹی کی خواہش کے لیے تمہارے سامنے ہوں۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔" وہ سر جھکا کے بولے تو زین کو لگا کہ جیسے کسی شکاری نے جال پھینک دیا ہو۔

"یہ ممکن نہیں ہے سر۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے فوراً انکار کیا۔

"کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ میں کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اب کوئی رشتہ نہ بنا سکتا ہوں اور نہ نبھا سکتا ہوں۔" اس نے ہر بات صاف صاف بتائی۔

"سحر بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں بھی سنبھال لے گی۔"

"جو خود کو نہ سنبھال سکے' وہ بھلا کسی کو کیا سنبھالے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی زبان پھسل گئی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ الجھے۔

"میرا مطلب ہے میں خود کو اگر نہیں سنبھال پا رہا تو اور کیسے کسی کو سنبھال سکتا ہوں۔" اس نے فوراً بات بنائی۔

"فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لے لو بیٹا۔۔۔ اور فیصلہ کرنے سے پہلے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی سن لو۔۔۔" وہ خاموش رہا۔

"میں بھی تمہاری طرح بہت تنہا تھا زین اور آج تک ہوں۔ مجھے میرے علاقے سے صرف اس لیے نکال دیا گیا کہ میں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ میں بہت پڑھا لکھا نہیں تھا۔ صرف بی۔ اے کیا ہوا تھا۔ اور میری بیوی ایم۔ اے۔ انگلش تھی۔ اس کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ سارا خاندان چھوٹ گیا۔ پنچایت نے میرے خاندان کو علاقہ بدر ہونے کا حکم دیا۔ مگر میرے باپ نے اپنا آبائی گاؤں اور گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ میں بھی جوانی کے نشے میں چور تھا۔۔۔ محبت کا نشہ بھی سر چڑھ کے بول رہا تھا' سو اپنے بوڑھے والدین اور ایک بہن کو چھوڑ کر اکیلا ہی اپنی پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ شہر آ گیا۔ وہ ایک اچھے پرائیویٹ

ادارے میں نوکری کرنے لگی۔ میں آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے راستے بدل لیے۔ اسے ایک دولت مند شخص مل گیا۔ اس نے مڑ کے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس سے کیا کیا چھٹ گیا۔ بچی۔ میں۔۔۔ جس نے اس کی خاطر سب کچھ ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب تنہا ہوا تو ماں باپ کی طرف بھاگا۔ وہاں جا کے پتا چلا کہ وہ تو میرے بعد قبر میں اتر گئے۔ آج میرے پاس دولت ہے لیکن میں خالی ہاتھ ہوں۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکے۔

زین نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

"میں صرف اس انتظار میں ہوں کہ میں سحر کو محفوظ ہاتھوں میں دے دوں۔" وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"سر! اس کے لیے آپ کو ایک مضبوط شخص ہی ڈھونڈنا چاہیے۔ میں تو بہت کمزور سا انسان ہوں۔" وہ زچ ہوا۔

"میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی بیٹی کی اچھی تربیت کی ہے۔ پھر بھی وہ کمی رہ ہی جاتی ہے جو ایک ماں کی تربیت میں ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے قریب ہے مگر پھر بھی فاصلہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔" انہوں نے اقرار کیا۔

"آئی ایم سوری سر۔۔۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"زین! وہ ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے بیٹا۔۔۔ اس کے نزدیک یہ دولت اور آسائشیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔" وہ بول رہے تھے اور پردے کے پیچھے کھڑی سحر کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

"سر آپ اپنی بیٹی کو مس جج کر رہے ہیں۔" سحر کے پسینے چھوٹ گئے۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔"

"مطلب، آپ اسی سے پوچھیے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"زین! کھل کے بات کرو۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

اس نے ڈاکٹر کی رپورٹس انہیں تھما دیں۔ وہ پڑھ کے نہ کوئی طوفان آیا تھا اور نہ زلزلہ، لیکن سیٹھ ارمغانی کی شخصیت کی عمارت زمین بوس ہو گئی۔ کتنے مان اور بھروسے کے ساتھ وہ اس شخص کے ساتھ بات کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے اور اس کی تربیت انہوں نے کی ہے۔ شرمندگی سے سر جھک گیا۔

نظریں تک ملانا محال ہو گیا۔

وہ سینہ مسلتے ہوئے ادھر ادھر بے چینی سے پھرنے لگے۔

"سر! آپ سحر سے پوچھیے اس آدمی کا نام۔۔۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" زین نے ان کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔

"زین! میں نے اگر اس کی پسند پر سر جھکا لیا تھا تو اللہ اور رسول کے نزدیک اس کی مرضی کو اس کا حق سمجھ کے۔ مگر میں اتنا بے غیرت تو نہیں ہوں کہ اس کی رسوائی کو گلے لگا لوں گا۔ تم پوچھ لو اس سے اس شخص کا نام اور رخصت کر دو اس کے ساتھ۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"سر! ہوش سے کام لیں۔"

"ہوش سے۔۔۔ ہوش سے کام لوں۔۔۔ میں۔۔۔ جس نے تمام عمر بیوی کی بے وفائی پر آنسو ضبط کیے رکھے کہ میرے سامنے سحر تھی جینے کی آس۔ اس نے یہ صلہ دیا۔ میری تمام عمر کی ریاضتوں کا یہ صلہ دیا اس نے۔۔۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے۔۔۔ مار دوں گا اسے۔۔۔" وہ دیوانوں کی طرح اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔ زین نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اسے زندہ دفن کروں گا۔۔۔" وہ دوبارہ اٹھے مگر پھر ٹوٹ کر بیٹھ گئے۔ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ دل پر بھاری بوجھ پڑا تو طبیعت بگڑنے لگی۔

"سر! پلیز خود کو سنبھال لیں۔"

"کیسے سنبھالوں خود کو۔۔۔ کتنا تماشا لگے گا۔ کیا یہ بات چھپ سکتی ہے۔" وہ سینے کو بری طرح مسلنے لگے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھ کر زین

نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور انہیں اسپتال لے گیا۔

"ہلکا سا انجائنا کا اٹیک ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا تو سحر کی سسکی نکلی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ڈیڈ کے لیے، تکلیف کا باعث بن گئی تھی۔



رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب چھوٹی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں سکندر کا جیل کا وہ کٹھن وقت اور وہ رو رو کر رب سے دعائیں مانگنا۔ اس کی آواز کا وہ درد جوان کا دل کاٹتا تھا۔ سنائی دینے لگیں۔

"اماں! زین سے کہیں... ایک دفعہ آکر مجھ سے مل لے۔ مجھے معاف کردے۔ بس ایک بار... آخری بار... اعتبار کرلے... معاف کردے... بس آخری بار۔"

سلاخوں کے اس پار وہ تڑپ رہا تھا اور ماں بے بس تھی۔

"میں اپنے مقام سے گرا ہوں... انسانیت کو رسوا کیا... اسی لیے تو سجدے میں گرا ہوں... گڑگڑا رہا ہوں... معاف کردے... بخش دے... رحم کردے... کہ تیرے پاس تو طاقت ہے... تو تو عالی مقام ہے... مجھ ناچیز کا گناہ بخش دے یا مجھے پل صراط پر چلا کہ میں یا ڈوب جاؤں یا پار لگ جاؤں... میرے رب... مجھ سے یہ دو دھاری تلوار کی اذیت نہیں سہی جارہی یا تو راضی ہوجا یا اسے منانے کے لیے کوئی راستہ دکھادے۔ مجھے اشارہ دے میرے رب... مجھے راہ دکھا... مجھے اس اذیت سے نکال... مجھے بخش دے..." وہ روتے ہوئے سجدے میں گر گیا تھا۔

"دعا سے کہو اماں... اس کی قبر پر لے کر چلو۔ اس سے کہو... وہ بھی معاف کردے۔ یا اللہ میں کس کس کا گناہ گار ہوں مجھے بچالے یا اللہ! اماں زین۔"

وہ چیختے چیختے نڈھال ہوجاتا تھا۔ عارفہ بیگم اس کی دیوانوں والی حالت پر روتیں... تڑپتیں... زین سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتیں کہ ایک دفعہ جاکر اس سے مل لو... مگر وہ نہ ملا... نہ معاف کیا۔

وہ بھلا معاف کرتا بھی تو کیوں... سزاوار کو اپنے کیے کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ نے بھی ہاتھ کے بدلے ہاتھ، آنکھ کے بدلے آنکھ... جان کے بدلے جان کہا ہے۔ وہ دشمن بن کر بھلے کچھ بھی کر جاتا مگر بھائی کے روپ میں اس نے جو کیا، وہ ناقابل معافی ہے۔ زین صاف انکاری ہوگیا تھا۔

وہ اٹھیں اور وضو کرکے، سکندر کی بے چین روح کے لیے ہاتھ اٹھالیے... نفل تہجد وظیفے...



"زین! یہ دیکھو میرے جڑے ہاتھ... میری کھوکھلی عزت کا پاس رکھ لو... میں مرجاؤں گا... میری نام نہاد عزت کا بھرم رکھ لو... میں پہلے اس کی ماں کے ہاتھوں رسوا ہوا اور اب بیٹی نے مجھے جینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ نجانے کیوں مجھے لگتا ہے تم میرا مان رکھ لوگے۔" سیٹھ ارمغانی اسپتال سے واپس آئے تو اس کے آگے بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"زین ایک بے بس اور مجبور باپ تمہارے آگے اپنی عزت کی خاطر ہاتھ جوڑتا ہے۔" انہوں نے حقیقتاً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"زین! صرف نکاح کرلو۔ بھلے ساری زندگی میرے گھر بیٹھی رہے۔ میری عزت بچالو زین... اس مجبور باپ کی عزت رکھ لو۔ جو سب کچھ کھو کے بنائی ہے۔ اچھے تھے وہ لوگ جو پیدا ہوتے ہی ان جیسیوں کو دفن کردیتے تھے۔" ان کی بے بسی زین سے برداشت نہ ہوسکی۔

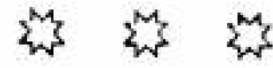
"سر ٹھیک ہے... میں سحر سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ شاید اسی طرح۔" وہ نجانے کیا بولنے چلا تھا کہ دروازے میں کھڑی سحر کی لرزتی آواز نے اسے ہوش دلا دیا۔

"نہیں... ڈیڈ... مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردیں... ورنہ میں خود کو ماردوں گی مگر۔" وہ ہلکی نقاہت زدہ آواز میں بول رہی تھی۔

"بکواس بند کرو... ایک گناہ دنیا میں کرلیا اور موت بھی ایسی ہی چننا چاہتی ہو جو حرام ہو۔" سیٹھ ارمغانی

نے انتہائی غصے سے کہا۔
وہ چپ ہو گئی کہ ڈیڈ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مزید کوئی بات کرتی۔
"سر! سادگی سے نکاح کر دیں۔ میں تیار ہوں۔"
زین نے سر جھکا کے صرف اتنا کہا۔
"زین! تم ہر بار میری زندگی میں فرشتہ بن کے آئے ہو۔ ایک بار میری زندگی اور اس بار میری عزت بچا رہے ہو۔ میں تمہارے احسانات کا حق کیسے ادا کر پاؤں گا۔"
"سر! احسانات کیسے... بے کار سی زندگی ہے۔ چلیں کسی کے کام تو آ گئی۔" وہ تلخی سے بولا اور کمرے سے نکل گئے۔
سحر بالکل چپ تھی۔ لبوں کو سی لیا تھا۔ جس کو پانے کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اب جب مل رہا تھا تو ارمانوں نے کفن اوڑھ لیا تھا۔
کچھ ہی لوگوں کی موجودگی میں وہ زین کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ اس نے سفید رنگ کا خوب صورت لباس پہنا تھا۔ نکاح کے بعد اسے زین کے ساتھ بٹھایا گیا تو سحر کی دوستوں نے اپنی سی کوشش کر کے وہاں شادی کا ماحول کر ڈالا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زین کی نظریں اس کی کلائیوں میں پڑی سلور اور سفید چوڑیوں کی اداسی بھری کھنک میں الجھ رہی تھیں۔
وہ کمرے میں آیا تو وہ یک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ بیڈ کے کنارے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دونوں کی نظریں جھکی تھیں۔ مکمل خاموشی... گہرا سکوت...
"تم سب بھول جاؤ... جو بھی ہوا... وہ تمہارا اور تمہارے اللہ کا معاملہ ہے۔ میں بھی ایک بہت گنہگار سا شخص ہوں۔ پتا نہیں اس رشتے کو نبھا بھی پاؤں گا کہ نہیں... سحر آئی ایم سوری... میں صرف یہ رشتہ کاغذ کی حد تک باندھ رہا ہوں۔ امید ہے، تم سمجھو اور اس مسئلے سے فارغ ہو کے اگر الگ ہونا چاہو تو بھی مجھے منظور ہو گا۔" وہ پتھر کا بت بنی رہی۔
دونوں کے درمیان ایک بار پھر آ گئی۔ دماغی طور پر دونوں اپنے اپنے محاذوں پر برسرپیکار تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا، لیکن وہ اپنی کیفیت سے باہر نہ آ سکی۔
"سحر... سوری... مجھے تمہارا پردہ رکھنا چاہیے تھا۔ سیٹھ صاحب سے شیئر نہیں کرنا چاہیے تھا۔" زین نے کہا تو وہ سوچ کے دائرے سے باہر نکلی۔ آنکھیں کھول کے زین کو دیکھا۔
اس کی گرفت سے خود کو نکال کے انتہائی سرد مہری سے بولی۔
"آپ نے کیا غلط کیا... ایک سچی بات ہی تو بتائی ڈیڈ کو..."
"کبھی نہ گرنا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ گر کے سنبھل جانا کمال ہوتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے تم سنبھل جاؤ گی۔" زین کے الفاظ گولی کی طرح اس کے وجود میں پیوست ہو گئے۔
"تو کیا مجھے ایک دفعہ گرنا ہو گا اپنا کمال دکھانے کے لیے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔
"اور نہیں... جتنا گرنا تھا گر چکی ہو... کافی ہے۔"
زین کو اس کی ڈھٹائی پہ غصہ تو بہت آیا مگر ضبط قائم رکھا۔
"اللہ آپ کو اس نیکی کے بدلے بہت بڑا اجر دے گا۔ آپ نے جہاں اتنا کیا ہے ایک درخواست اور مان لیں۔"
"بولو..."
"اپنے بیان پر قائم رہیے گا۔ اس رشتے کو نکاح تک ہی محدود رکھیے گا۔"
"بے فکر رہو۔ تم میرے گھر میں رہتے ہوئے بھی مجھے محسوس نہیں کرو گی۔ اس رشتے کا ایک ہی مقصد تھا، جو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد خود کو آزاد کروا لینا۔" وہ چلا گیا۔
ٹیرس پہ سگریٹ پیتے زین کو دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔
زین نے اس کی نگرانی پہ ایک آدمی کو لگا دیا جو فلیٹ

کے ارد گرد ہی رہتا تھا۔ زین کو ڈر تھا کہ وہ بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ وہ اس فلیٹ میں قید ہو کے رہ گئی اس نے کبھی باہر جانے کی ضد نہ کی۔ وہ خود ہی اسے سیٹھ ارمغانی سے ملوانے لے جاتا۔



زین کبھی کبھی خود سے لڑ لڑ کے تھک جاتا تھا تو سارا غصہ سحر پہ ہی اتارتا۔ کچھ ایسا کہہ جاتا جو سحر کے جسم کو آری سے کاٹ ڈالتا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ملازمہ اسے اکثر بتاتی کہ وہ بہت ہی کم کھانا کھاتی ہے۔ دودھ وغیرہ بھی نہیں لیتی تھی۔

ملازمہ نے ہی اطلاع دی کہ بی بی کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ پیٹ میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

اس وقت بھی اس کے اندر طوفان بپا تھا۔ تباہی مچی تھی۔ اٹھا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ زین کو آتے دیکھا تو جلدی سے سیدھی ہو کے بیٹھی اور چادر اپنے گرد لپیٹی۔

"صبح تیار رہنا۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے۔"

"مجھے کسی کو نہیں دکھانا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تب دکھا دیا تھا جب اسے چھپانے کا وقت تھا۔ اب تو بے خوف ہو کر جانا چاہیے کہ اس بچے پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔"

"میں تب بھی خود نہیں گئی تھی۔"

"کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم کہ تم پر ظلم ہوا ہے۔"

"جہاں آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی لوگ نابینا اور کان سنتے ہوئے بھی بہرے ہو جائیں جہاں رشتوں کو بے اعتباری کی نذر کر دیا جائے وہاں کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کیسے، سزا سے بچ سکتا ہے۔۔۔"

"مجھ سے زیادہ کس نے بے گناہی کی سزا سہی ہو گی۔" وہ لمبی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"اس کا بدلہ پھر آپ نے مجھ سے لے لیا۔"

"مجھے عادت نہیں ہے بدلہ لینے کی۔۔۔ میں نے ہمیشہ ہار مانی ہے۔ اب بھی چاہتا ہوں کہ تم بھی سب بھول کر اپنا خیال رکھو۔"

"اپنا خیال رکھوں کس کے لیے؟ کسی کو میری ضرورت نہیں ہے حتی کہ میرے باپ کو بھی نہیں۔"

"تھوڑی سی بھی اگر شرم ہے تمہارے اندر۔ اپنے گناہ پر نادم ہو، تو مزید گناہ کے راستے پر نہ بڑھو۔۔۔"

زین کو اس کی ڈھٹائی پر آگ لگ گئی۔

"نہیں ہے میرے اندر تھوڑی سی بھی شرم۔۔۔ بیچ دی ہے میں نے۔۔۔" وہ چلائی تو زین کا مضبوط مردانہ ہاتھ اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

کمرے میں سحر کی آنکھوں سے برسات جاری تھی، اور باہر اس کے وجود میں آگ لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ اپنی دعا کی قبر پہ بیٹھ کر زندگی گزار دے۔ مجاور بن جائے اور وہیں موت اس پر مہربان ہو جائے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

گھبرانے لگا۔ اس کے اندر کا غبار بڑھا تو وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اس وقت بھی وہ درد کی شدت سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

"سحر۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔" وہ اسے گاڑی تک لایا اور اسپتال پہنچایا۔

ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کے دیے۔

ڈاکٹرز نے رپورٹس اسے تھمائیں اور بتایا کہ کم خوراکی ہے، پیٹ میں درد ہے۔ اس نے خود پریگننسی کا کہا تو ڈاکٹر نے اس سے انکار کیا کہ ایسی کوئی بات ہے۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔۔۔" زین کی آواز پھٹ گئی۔

ایک آسمان ٹوٹا تھا۔ کڑکتی ہوئی بجلیاں زین کو ہلا گئیں۔

یہ سب کیا ہوا ہے۔ وہ الجھن میں پھنس گیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا کہ کہیں اس نے بچہ مار تو نہیں ڈالا۔

"کیا کیا ہے تم نے بچے کے ساتھ۔۔۔؟" اگلے دن وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"کیا تم نے بچے کو۔۔۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"لیکن تمہاری اسپتال کی رپورٹ۔۔۔ جب تم۔۔۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بولے اور کیسے پوچھے۔

"ان کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی تو زین پریشان ہو گیا۔

"لیکن تم تو بالکل پہلے جیسی ہی ہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" وہ اس کی ظاہری اور جسمانی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

"ڈاکٹر نے تمہارے سارے ٹیسٹ کیے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔"

"دوبارہ معلوم کریں۔"

"ڈاکٹر کو چھوڑو۔۔۔ تم بتاؤ مجھے۔۔۔"

"ڈاکٹر کو کیسے چھوڑوں۔۔۔ رہی میری گواہی تو اس کا کیا اعتبار۔۔۔ تب نہیں مانی گئی تو اب کیوں۔ اب صرف انتظار کریں اس وقت کا آپ بھی اور میں بھی۔۔۔ جب میری گود میں بچہ آئے گا۔"

زین نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"دیکھو سحر۔۔۔ مجھے مزید مت الجھاؤ۔۔۔ میں بہت ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔۔۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کیا یہ کوئی غلط فہمی تھی۔"

"غلط فہمی۔۔۔ زین۔۔۔ کیا یہ لفظ مناسب ہوگا۔ کسی کی عزت 'وقار' 'انا' 'کردار' 'اعتبار'۔۔۔ سب داؤ پہ لگ گیا اور آپ پلڑے میں ایک لفظ غلط فہمی کو رکھنا چاہ رہے ہیں۔"

"تو کیا یہ۔۔۔" سحر کو اس کی آواز کا کھوکھلا پن صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ہو جانے والے حادثے کی واضح تحریر پڑھی جا سکتی تھی۔

"جی۔۔۔ ایسا کچھ اس وقت بھی نہیں تھا زین! جب آپ نے میرے باپ کے سامنے مجھے ذلیل کیا تھا۔ مجھ پر میرے بے داغ کردار پر تہمت لگائی تھی۔ میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔۔۔ نہ آپ کو اور نہ سیٹھ ارمغانی کو۔۔۔ کیا حق تھا آپ دونوں کو مجھے بے عزت کرنے کا۔" وہ چلانے لگی۔

"تمہارے سامنے ہی تو اس اسپتال میں ڈاکٹر نے یہ سب کہا تھا۔" زین نے اسے کندھوں سے تھامنا چاہا تو وہ جھٹکے سے اس سے دور ہوئی۔

"اسی اسپتال سے ایک دن بعد فون بھی آ گیا تھا' معذرت کا کہ انہوں نے غلطی سے سائرہ نامی لڑکی کی رپورٹ مجھے دے دی تھی۔"

"سحر۔" اس نے سخت بے بسی سے اسے پکارا۔

"اگلے ہی دن میں نے شہر کے چار اسپتالوں سے ٹیسٹ کروائے تھے زین۔ یہ لیں۔۔۔ میں جانتی تھی کہ مجھے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" وہ پاگلوں کی

طرح اپنے بیگ کی جانب دوڑی اور زپ کھول کے اندر سے فائل نکالی اور پھر بے زین کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"یہ دیکھیں وہ رپورٹ جو آپ نے وصول کی تھی۔ پڑھیں اس پر لکھا نام۔۔۔"

"تم نے بتایا کیوں نہیں۔۔۔" زین نے فائل کی طرف دیکھے بنا گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"کیونکہ کسی نے مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ہی پوچھا۔ بس سزا سنا دی۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

"آئی ایم سوری سحر۔۔۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔۔۔" زین کے وجود میں یک دم ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسے لگا ایک دفعہ پھر اس کی دعا تیزاب سے جل رہی ہو مگر اب کی بار زین کا وجود آزاد تھا۔ کسی کے ہاتھوں کے شکنجے میں نہیں تھا۔ اس بار اس نے جلایا تھا کسی سکندر نے نہیں۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ دونوں جل رہے تھے۔ دونوں ہی۔۔۔ وہ بے اعتباری کی آگ میں اور وہ ندامت کی آگ میں۔۔۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اپنا قول نہ بھولیے گا۔ وہ یاد ہوگا۔" وہ اسے کیا یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔ کک۔۔۔ کون سا قول۔۔۔" اس کا دل کانپا کہ وہ یک دم بہت اجنبی سی بن گئی تھی۔

"آپ نے کہا تھا کہ جوں ہی میں بچے سے فارغ ہو جاؤں گی اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکوں گی۔ اب میں فارغ ہو گئی ہوں۔ کیا میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں؟"

"سحر۔۔۔ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ آئی ایم سو سوری۔" وہ بے تحاشا شرمندہ تھا۔

"اب شرمندہ ہونے سے کوئی فائدہ ہے نہ نقصان۔ بس مجھے آزاد کر دیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ امید ہے آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

"معاف نہیں کر سکتی ہو۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"سحر! میری بات سنو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنے قول سے نہیں پھرتے۔" وہ چیخ گئی۔

"تم بھی جس محبت کی دعوے داری کر رہی تھیں، اس سے پیچھے ہٹ رہی ہو۔"

"ایک عزت بچانے کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا اور اب اس معاہدے کی مدت ختم ہو گئی ہے۔" وہ چیخ پڑی۔

"پاگل مت بنو سحر۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے تمہارے ساتھ، لیکن اس کی سزا خود کو دینا عقل مندی تو نہیں، میں نے غلطی کی، میں سزا سہنے کو بھی تیار ہوں۔"

"مجھے کسی کو کوئی سزا نہیں سنانی۔ بس میرا فیصلہ کر دیں۔" وہ کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ خیال آنے پر وہ دوبارہ اس کے کمرے میں گیا تو وہ نہیں تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح سیٹھ ارمغانی کے پاس پہنچا۔ حسب توقع وہ وہیں تھی۔ اس کا سانس بحال ہوا۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے زین۔۔۔ میں اس کی ماں کے کیے کی سزا اسے سنا بیٹھا۔ اسے موقع ہی نہیں دیا، کیوں اتنا بے رحم ہو گیا تھا میں۔"

اب وہ موقع دینے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجاتا رہا مگر وہ نہ کھلا۔

زین ایک دفعہ پھر ہارا تھا۔ ایک اور مات مقدر ہوئی۔ اب کے اس میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس بار وہ اپنے ہی ہاتھوں ہارا تھا اور اس بار یوں ٹوٹا کہ دوبارہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ کچھ سننے اور ماننے کو تیار نہ تھی یہاں تک کہ سیٹھ ارمغانی کی بھی۔۔۔

رات بستر پر آئی تو نظروں کے سامنے زین کی تصویر گھوم گئی۔ اتنے ظالم لگتے تو نہیں تھے تم... پھر کیوں زین... کیا یہ محبت کا بدلہ تھا۔ شرمندگی بھرے، چند جملے۔ ندامت... اور تھوڑی سی مزاحمت کہ سحر مت جاؤ اور پھر یہ کہہ کے راستے سے ہٹ جانا کہ میرے مقدر میں صرف ہارنا ہی لکھا ہے... سب کچھ تو میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے زین... تو پھر میں نے محبت کی... جنگ لڑی اور جیت بھی لی... یہ میرا دعوا ہے... جھٹلا کر دکھاؤ... اب لیکن میری ضد ہے کہ باقی کی جنگ تم لڑو... دوبارہ دامن کے ساتھ اب بھی میں ہی قدم بڑھاؤں کیا۔ یہ زیادتی نہیں ہے میرے ساتھ زین... ایک دفعہ زین... صرف ایک دفعہ مجھے اذن سفر تو دو... میں تو کب سے تیار ہوں... میرا اسباب سفر تو میرا محبت بھرا دل ہے، جس کو صرف تمہاری تمنا ہے...

وہ روتی رہی... سلگتی رہی۔ تڑپتی رہی۔



وہ تینوں سیٹھ ارمغانی کے محل نما گھر آ گئے۔

سیٹھ ارمغانی انہیں دیکھ کر پتھر کے بت بن گئے۔

"زینت...!" ان کا سر جھکا رہا۔

"یہ تلخ اور کڑوی حقیقت ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو۔" وہ تلخی سے گویا ہوئے۔

"تم تو سب کچھ مجھ سمیت جہنم میں جھونک گئی تھیں۔ پھر آج میری دہلیز تک کیسے آنا ہوا۔ کیا یہ دیکھنے کہ اس آگ میں جلے وجود کیسے زندگی گزار رہے ہیں تو دیکھو... یہ ہے وہ بچی، جس کو تم پھینک کر چلی گئی تھیں۔ اس کے کردار پر وہ داغ لگا، جو جرم اس نے نہیں کیا اور تم کتنی گنہگار تھیں، مگر بنا سزا کے زندگی گزار رہی ہو۔ تم نے تو کوئی سزا نہیں سہی، سزا تو میں اور میری بیٹی سہہ رہے ہیں۔" سیٹھ ارمغانی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے۔

انیس ابتسام نے زینت بی بی کے پتھر وجود کو تھام رکھا تھا۔

عارفہ بیگم آگے بڑھیں اور سحر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر صوفے تک لے کے آئیں جہاں زینت بی بی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ ماں اور بیٹی ملیں تو آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔

"میری بچی... مجھے معاف کر دو... اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل خاموش تھی۔

"سحر بچی... کچھ تو بولو۔" زینت بی بی نے اس کے پتھر وجود کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ ہنوز خاموش رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی۔

وہ کیسے اس عورت کو قبول کر لیتی جو اسے اور اس کے ڈیڈ کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

وہ مایوس ہو کر چلی گئیں تو ڈیڈ اس کی طرف آ گئے۔

"سحر وہ تمہاری ماں ہے... مت ٹھکراؤ اسے... معاف کر دو۔"

"ڈیڈ! پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔" اس نے چہرہ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا... سب اللہ پر چھوڑ دو... وہ بہت کرب سے گزر رہی ہوگی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ممتا کبھی نہیں مرتی۔"

"ڈیڈ! میں آپ کے کرب کا اندازہ بھی کر سکتی ہوں۔"

"سحر! میاں بیوی کا رشتہ دنیاوی رشتہ ہوتا ہے۔ توڑا جا سکتا تھا، سو اس نے توڑ دیا، لیکن تم سے جو رشتہ ہے وہ نہ تم توڑ سکتی ہو اور نہ وہ... خونی رشتہ ہے تمہارے اور اس کے درمیان..."

"رشتے جذبوں سے پروان چڑھتے ہیں ڈیڈ... اور ان جذبوں کو انہوں نے اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے۔"

"تمہاری جنت ان ہی قدموں کے نیچے ہے۔ بہتر ہوگا

کہ تم سب، کچھ بھول کر اس کے دکھ میں شریک ہو جاؤ۔"

"ڈیڈ...." وہ ان سے لگ کر رو دی۔ دونوں کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ٹھک.... ٹھک.... دروازہ بجا تو وہ بمشکل اٹھا اور دروازہ کھولا، مگر سامنے چھوٹی ماں اور نحیف اور کمزور سے کھڑے ابا جان کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔

"آپ...." زین نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔

"زین میرے بچے.... ہمیں ضرورت ہے تمہارے سہارے کی۔" وہ پیلے پڑے زین کے چہرے کو دیکھ کر تڑپ گئے، جو پچھلے تین دن کے بخار کی وجہ سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔

"مگر مجھے تو خود ضرورت ہے سہارے کی ابا جان.... کیسے سہارا بن سکتا ہوں میں کسی کا...."

"ہم اتنے عرصے سے دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں...." انیس ابتسام اس کے ساتھ لگ کر بولے۔

"میں نے سب کو معاف کر دیا ہے.... پلیز آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ آزاد چھوڑ دیں مجھے.... مجھے میری زندگی جینے دیں.... میں یہاں بہت سکون میں ہوں۔ زندگی میری خواہش کے عین مطابق ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تمہیں ہمارے ساتھ رہنا منظور نہیں تو اپنی تائی اماں کا سہارا بن جاؤ۔"

"تائی اماں...." وہ حیران ہوا۔

"بھابھی بہت تنہا ہو گئی ہیں۔ بیٹی مل تو گئی ہے، مگر معاف کرنے کو تیار نہیں۔ انہیں کچھ نہیں ملا نہ زندگی سے اور نہ رشتوں سے...." چھوٹی ماں نے کہا تو زین نے سر جھکا لیا۔

"زین! مجھے معاف کر دو۔ اپنی گنہگار ماں کو معاف کر دو۔" عارفہ بیگم نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"میں نے کبھی بھی آپ کو گنہگار نہیں سمجھا اماں.... سکندر نے جو کچھ کیا اس کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ آپ کیوں اس کی وجہ سے شرمسار ہو رہی ہیں۔" زین نے ان کے جڑے ہاتھ تھام لیے۔

"میں نے ہر لمحہ خود کو تمہارے لیے تڑپتے دیکھا ہے زین بیٹا.... میں نے سکندر کی موت کو دل سے قبول کر لیا ہے، مگر تمہاری جدائی میرے دل کے لیے ناقابل قبول ہے۔ وہ گھر تمہاری آمد کا منتظر ہے اور میں نے تمہیں ساتھ لے کر ہی جانا ہے۔ مجھے یقین ہے تم میرا مان نہیں توڑو گے۔" وہ بولتی گئیں۔

"اماں...."

"زین! میں تمہاری اذیت کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ سکندر سے مجھے محبت تھی، مگر اس کی درد بھری موت کی اذیت میں اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں، اس کا دکھ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ میری عمر بھر کی پونجی تھا سکندر۔ لٹ گئی، لیکن جو خزانہ اب میرے ہاتھ لگا ہے تمہاری محبت کی صورت، وہ انمول ہے۔ اب اسے میں لٹنے نہیں دوں گی۔" وہ آنسو بھری آواز میں بولیں۔

زین نے نظریں جھکالیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان کو اس عمر میں جدائی کی اذیت دینا مناسب نہ تھا۔

زین نے ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمو لیا۔ پھر تو وہ ان کے ساتھ لگ کر اتنا رویا کہ خود ان دونوں کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ان دونوں نے اللہ کے بعد فہد کا ڈھیروں شکر ادا کیا کہ جس کی بدولت وہ زین تک پہنچ پائے تھے۔ فہد زینت بی بی کے بھائی کا بیٹا تھا اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہیں سکون نہیں ملا تائی اماں! اس لیے لوٹ آیا ہوں۔" تائی اماں کے گلے لگتے ہوئے اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی۔

"زین! تیرے ساتھ تیرے ماں باپ کی دعائیں تھیں۔ تو خوش قسمت ہے میرے لال۔" اسے اپنے کمزور سے بازوؤں میں چھپا کے وہ کتنی دیر روتی رہیں۔

"تائی اماں! خوش قسمت میرے جیسے ہوتے ہیں کیا۔ جو ساری زندگی ادھورے رہتے ہیں، جن کی جھولی میں صرف ناکامیاں ہوتی ہیں۔" وہ اپنے خالی ہاتھوں پر نظریں جمائے مایوسی سے بولا۔

"نہیں میرے بچے! ایسے نہیں کہتے۔ وہ رب کسی کو اس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اس نے تیرے حصے کی خوشیاں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

وہ اداسی سے مسکرادیا۔

وہ تائی اماں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اب تنہا نہیں تھیں۔ ابا جان نے زین کو بتایا کہ انہوں نے تائی اماں کے پہلے شوہر سے رابطہ کرلیا ہے اور اب ان کی بیٹی بھی جلد ہی مان جائے گی۔

"تائی اماں! ایک اقرار کرنا چاہتا ہوں۔" سر جھکا کر بات کرنے کی ہمت کی۔ کئی دفعہ ہمت باندھتا کہ تائی اماں کو اپنی شادی کے متعلق بتائے۔ پھر چپ رہ جاتا۔

"بولو میرے بچے۔۔۔"

"میں نے دعا کی محبت سے بے وفائی کی ہے۔ کسی اور سے شادی کرلی ہے۔" تائی اماں کے دل کو دھچکا تو لگا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"یہ بے وفائی نہیں ہے اللہ کی رضا میں راضی ہونا ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ کیا سب جانتے ہیں۔ بھائی جان اور بھابھی۔۔۔"

"صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔" اس نے وہ بات جو اپنے ماں باپ سے بھی چھپا رکھی تھی۔ انہیں اپنے اوپر بیتنے والی ساری اذیت بتادی۔

"اوہ۔۔۔"

"تائی اماں! میری نہ کوئی دعا قبول ہوئی اور نہ میرے مقدر میں کوئی چمک دار سحر ہے۔ میں وہ سیاہ بخت ہوں جو بہتے دریا پر چلا جائے تو وہ بھی خشک ہوجائے۔" وہ خود سے مایوس تھا۔

"اب صرف چند قدموں پر خوشی تمہاری منتظر ہے جان۔۔۔ اب ان شاء اللہ یہ کالی رات کٹ جائے گی۔" وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

"تو اسے منالے میرے بچے! اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں مانتی تائی اماں۔۔۔ بہت کوشش کی ہے۔" وہ ہار مانے بیٹھا تھا۔ "میں اسے واپس لاؤں گی۔" وہ بولیں۔

"کبھی نہیں آئے گی۔" اس نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں زین! عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتی ہے اس سے ضد تو لگا سکتی ہے مگر اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرتی۔" تائی ماں نے کہا تو وہ سر ہلا کر مسکرادیا۔

"پتا ہے زین! میں سوچ رہی تھی کہ ایک دفعہ پھر تمہیں آزمائش میں ڈالوں گی۔ اپنی دوسری بیٹی کے لیے تمہارے آگے جھولی پھیلاؤں گی۔ مگر۔۔۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"تائی اماں! کیا اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔۔۔" زین نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ تب ہی تو اپنے گھر میں تھی۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔۔۔ اللہ نے ہر ایک کے حصے کی خوشیاں رکھی ہوتی ہیں۔ بس وقت کا انتظار صبر سے کرنا چاہیے۔"

"بے شک ایسا ہی ہے اور ان شاء اللہ تمہارے حصے کی خوشیاں بھی بہت جلد تمہارے دامن میں ہوں گی۔" وہ دعائیں دینے لگیں تو اس نے آمین کہا۔

کمرے میں آیا تو بے چینی سے سگریٹ پر سگریٹ پینے لگا۔ پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔۔۔ سحر۔۔۔" بے تابی سے پکارا۔

"جی بول رہی ہوں۔" دھیمی سی آواز کانوں میں

گونجی۔

"میں جانتا ہوں میرے جرم کو معاف کرنا آسان نہیں، مگر تمہیں مجھ سے محبت بھی تو ہے۔۔۔ یا وہ بھی میری سیاہ بختی سے، ہار گئی ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ آنسو دامن کو بھگوتے رہے۔

"سحر۔۔۔ پلیز۔۔۔"

"زین! میرے، مقدر میں تو ماں کا ہی پیار نہیں تھا اور کسی کا کیا ملتا، میں نے تسلیم کرلیا ہے کہ آپ میرا مقدر نہیں ہیں۔ زبردستی میں آپ کی زندگی میں داخل نہیں ہوسکتی۔"

"کیا تم یہی چاہتی ہو کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔۔۔"

"میں کیا چاہتی ہوں اس بات کو چھوڑیں۔ جو آپ چاہتے ہیں وہ کریں۔ میرے ساتھ آج تک جو کچھ ہوا، کیا وہ میں نے چاہا تھا۔" اس نے روتے ہوئے فون بند کردیا۔

☆ ☆ ☆

"سحر۔۔۔ مجھے معاف کردو میں بھٹک گئی تھی۔ نفس کی غلام ہوگئی تھی، میں نے محبت اعتبار، رشتے۔۔۔ سب کو رسوا کیا، لیکن ممتا کی تڑپ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی۔ میں نے اپنی بچی کا نام تمہارے نام پر رکھا اپنے شرمندہ ممتا کے جذبے کی تسکین کے لیے، لیکن مجھے سزا مل گئی جس رشتے کی قدر نہ کرسکی، وہ پھر بھی مجھے نصیب نہ ہوا۔" وہ بے بسی سے رو رہی تھیں۔ سحر سیٹھ ارمغانی کے اصرار پر ان سے ملنے بالآخر آہی گئی تھی اور اب ان کے، ساتھ لگ کر آنسو بہائے جارہی تھی۔

کتنا بڑا درد ان کے نام ہوا تھا۔ ان کی ممتا کی تڑپ سب کو جھلسا رہی تھی۔ کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی درماں نہیں ہوتا۔ کچھ زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوپاتے۔

"سکون تو آپ کی اس بیٹی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ تقدیر نے قدم قدم پر وہ چوٹ لگائی کہ یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ آپ کی بیٹیاں بہت بدقسمت ہیں۔"

انیس ابتسام اور عارفہ بیگم نے، دونوں ماں بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا۔

اس وقت زین کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ابا جان نے بتایا کہ تمہاری تائی اماں کی بیٹی آئی ہوئی ہے۔ مل لو۔ وہ ان کی طرف آیا تو دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے سحر کو وہاں دیکھ کر۔ سحر تائی اماں کی بیٹی۔۔۔

دعائے سحر۔ زین کو یاد آیا۔۔۔ یہی نام نکاح کے دن مولوی صاحب نے لیا تھا۔

"آؤ۔۔۔ بیٹا! باہر کیوں کھڑے ہو۔۔۔ آؤ میں تمہیں اپنی بیٹی سے ملواؤں۔" تائی اماں کی نظر اس پر پڑی تو مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔

"دعا! یہ میرا بیٹا۔۔۔ زین۔" تائی اماں کے کہنے پر وہ مڑی اور پتھر کی بن گئی۔

"آپ کا بیٹا۔۔۔"

"سحر۔۔۔" زین نے بے یقینی سے، اسے پکارا۔

"زین۔۔۔ تم جانتے ہو سحر کو۔۔۔ تو کیا یہ ہی وہ سحر۔۔۔ وہی۔۔۔" وہ بھی الجھ گئیں۔

"جی تائی اماں! یہ سحر ہے میری بیوی۔۔۔" زین نے جھٹ اقرار کیا۔

تائی اماں کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ ان کے چہرے کے، خوشی کے رنگ دیکھ کر سحر کچھ بول بھی نہ سکی۔

"ایک منٹ۔۔۔ میں اپنے بچوں کے لیے شکرانے کے نفل ادا کر آؤں۔۔۔" تائی اماں جان بوجھ کر درمیان سے ہٹ گئیں کہ دونوں کے درمیان موجود برف کی دیوار ان کے ایک اور رشتے کی نوید بن کر پگھل جائے۔

وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ چہرے پر بھرپور سنجیدگی تھی۔ زین نے اس کا ہاتھ تھاما، مگر وہ مکمل بے نیاز تھی۔

"معاف کردو۔۔۔ پلیز۔۔۔ میری جھولی میں یہ سوچ کر خوشیاں ڈال دو کہ تم میرے دل کی خوشی ہو۔ میری زندگی کی ایک مدھم سی امید۔۔۔ بہت غلط کیا تمہارے

ساتھ۔۔۔ دراصل میرے ساتھ کبھی اچھا ہوا ہی نہیں جو میں کسی کے ساتھ اچھا کرتا۔"

"زین۔۔۔" وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے لگ کر رو تی چلی گئی۔ خود زین کے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے۔

"بہت برا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔۔۔ بہت برا۔۔۔" وہ خفگی سے بولی۔

"سحر! جرم ناقابل معافی ہو تو الفاظ لبوں پر نہیں آتے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگنے کے بجائے اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتا رہا ہوں۔ یقین جانو میں نے ارادتاً وہ سب نہیں کیا تھا۔" وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"اللہ کو منالینا آسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن زین! بندوں کے درمیان حساب کتاب بہرحال بندوں کے درمیان ہی ہوتا ہے میرا اور آپ کا حساب کتاب ابھی باقی ہے۔" وہ نظریں ملائے بنا بولی۔

"ہر حساب کتاب کے لیے تیار ہوں۔ بہت ندامت اور شرمندگی ہے میرے دامن میں۔ بنا حساب لیے تو مجھے بھی سکون نہیں ملے گا۔"

"زین میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ رو پڑی۔ زین نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا اور مضبوط کر ڈالا۔

تائی اماں نے اندر آنے سے پہلے گلا صاف کر کے اپنے آنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے الگ ہوئی۔ ان کے شاداب چہرے تائی اماں کے دل کا گلشن مہکا گئے۔ فوراً" ان دونوں پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔ ڈھیروں دعائیں دیں۔

زین اسے ابا جان اور چھوٹی ماں کی طرف لے آیا۔

"زین بیٹا! اللہ نے بہت کرم کر دیا ہے۔" ابا زین کو گلے لگا کر بولے۔

"اب وقت ضائع مت کرو۔ اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرو۔"

"ابا۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ بس تھوڑا وقت لگے گا سیٹ ہونے میں۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکرایا۔

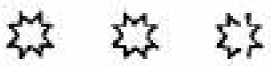
"میری جان۔۔۔ میری زندگی کی ایک ہی خواہش باقی ہے کہ میں اپنے بیٹے کے چہرے پہ سکون اور بھرپور خوشی دیکھ سکوں۔ بہت دکھ ملے ہیں تمہیں۔۔۔ اب ایک ہی صورت میں سکون میں پا سکوں گا' جب اپنے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں دیکھوں گا۔" ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے اس میں دوسری دعا کا چہرہ نظر آیا ہے اور وہ تمہاری تائی اماں کی بھی دل کی تمنا ہے۔ ان کا سکون ہے،' جو ان کی دعا کے ساتھ ہی کھو گیا تھا۔"

زین نے مسکرا کے ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

"جاؤ میری بیٹی کو اس کے گھر چھوڑ کر آؤ۔" انہوں نے سحر کو اپنی ماں سے ملنے بھیجا تھا اور وہ زین کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ جب ساری بات ان کے گوش گزار کی گئی تو انہوں نے زین کو گلے لگا لیا۔

سکون کی ایک لہر نے ان کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا۔



اگلے دن سب، تائی اماں سمیت اسے لینے پہنچ گئے۔ اماں نے اس کے لیے جلدی جلدی جو ہو سکا خرید ڈالا۔ سیٹھ ارمغانی کے چہرے پر خوشی تھی۔

"سیٹھ صاحب، ہم سحر کو اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہے ہیں۔۔۔ خواب میں بھی آپ اسے یاد کریں گے تو ہم اسے آپ کے پاس بھیج دیں گے۔" چھوٹی ماں سحر کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

سیٹھ ارمغانی نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔

وہ رات اپنے دامن میں ستاروں کی بارات لے کر آئی تھی۔ ہر طرف روشنی تھی۔ محبتوں کی بارش نے دونوں کے وجود کو بھگو دیا۔۔۔ عجیب سا سرور تھا۔ نشہ

تھا۔۔۔ محسوسات اور جذبات کی عجیب سی دنیا تھی کہ قدم بہکنے لگے تھے۔

محبت کی پناہوں میں میٹھی نیند آئی۔ اذان کی آواز پر وہ اٹھا تو سحر بیڈ پر نہیں تھی۔

یہ سوچ کر کہ وہ اماں ابا کی طرف گئی ہوگی۔ زین نماز کے بعد سیدھا وہاں پہنچا، جہاں اس کے قدم پہنچ کے لڑکھڑا گئے۔ اس مٹی کے ڈھیر پہ کوئی اس سے پہلے ہی ہاتھ اٹھائے ہتھیلیوں کو آنسوؤں کی برسات سے بھگو رہا تھا۔ کون تھا۔۔۔ وہ الجھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس سائے کے سامنے آن کھڑا ہوا مگر دعا میں مگن وجود نے اس کی جانب ایک نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ زین کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

"سحر تم یہاں۔۔۔" زین نے حیرت سے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ زین کو کندھے پر دباؤ محسوس ہوا تو وہ پلٹا۔ چھوٹی ماں اس کے سامنے تھیں۔ رویا رویا چہرا۔

"اسے میں لائی تھی۔"

زین کی حفاظت میں سحر کو دے کر وہ پلٹ گئیں۔

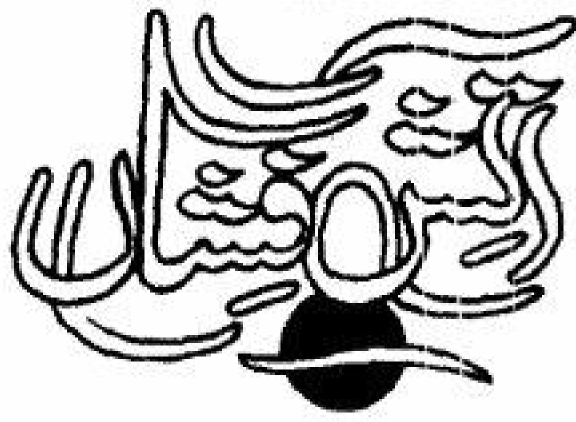
"آپ کو برا تو نہیں لگا میں آپ سے اجازت کے بغیر گھر سے۔۔۔ نکلی۔" سحر نے پوچھا تو زین نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"سحر۔۔۔ میری آدھی زندگی اس مٹی کے ڈھیر کے نیچے اور آدھی تمہاری پناہوں میں ہے۔۔۔ نہ اس سے ناراض ہو سکتا تھا۔۔۔ نہ کبھی تم سے۔۔۔ میری تو اب یہی دعا ہے کہ تم خوش رہو۔۔۔"

زین نے مسکرا کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور جذب دل سے دعا مانگنے لگا۔

اور دعائیں تو یوں ہی منظور ہوتی ہیں۔۔۔ اس کے لیے صرف رب کا در کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ بے شک نوازنے والی ذات ایک ہی ہے۔ آزمائش تو وہ اپنے محبوب بندوں کے نصیب میں ہی لکھتا ہے۔

سیما بنتِ عاصم



تابندہ نے جلدی جلدی دال میں بگھار لگایا اور دوسری پتیلی میں کڑکڑاتے گرم مسالے اور تیز پات میں بھیگے ہوئے چاول جھونک کر پانی بڑھایا۔ دیگچی میں چمچہ چلاتے ہوئے اس کے گداز خوب صورت ہاتھوں کی سرخ چوڑیاں چھن چھن بج رہی تھیں۔ قریب کھڑی اس کی سات سالہ بیٹی عرشیہ نے حسرت سے اک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس نے تابندہ کی شادی کی تصاویر دیکھی تھیں۔ آٹھ سال پہلے وہ کتنی من موہنی کومل سی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جیسے تلخی حالات کی دھوپ نے اس کا رنگ و روپ کملا دیا تھا۔ وجود پر سرتاپا یاسیت کا بسیرا تھا۔ انہیں نانی کے گھر آئے ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا اور اس ہفتہ بھر میں اپنے گھر سے نہ کوئی رابطہ' نہ واسطہ۔ چند گلیاں چھوڑ کر اس کا ددھیال تھا' جہاں اس کے پاپا تھے اور آتش فشاں جیسا مزاج رکھنے والی الماس پھپھو' جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔

تابندہ نے میکے آتے ہی ہمیشہ کی طرح سارے کاموں کا بوجھ اٹھالیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک جتی رہتی۔ یہاں وہاں سے کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لیتی۔ محض امی کے اس سوال سے بچنے کے لیے کہ ''تم گھر کب جاؤ گی یا یہ کہ اتنے دن ہوگئے' تنویر نے مڑ کر خبر بھی نہ لی۔ آخر بات کیا ہے؟''

امی پر اس کی تلخ زندگی کا ہر پہلو خوب روشن تھا' اس لیے ہولتیں۔ مگر یہ بھی تھا کہ کسی بھی وجہ کو لے کر وہ کبھی میکہ آکر نہیں بیٹھی تھی' نہ دکھڑے روتی۔ شاید اسی لیے تنویر بھی اس کا فیصلہ بدل جانے کا منتظر تھا' جو وہ چلتے وقت سنا کر آئی تھی۔ اس نے امی سے لوٹنے کا کوئی ذکر کیا تھا اور نہ ہی لوٹنے کا کوئی ارادہ تھا۔

وہ پہلا دن تھا۔ شازیہ امی کو کھانے کی ٹرے دینے آئی تو اسے دیکھ کر منہ بنا کے چل دی۔ پھر وہ خود ہی سمجھ گئی کہ اب چھٹی۔۔۔ وہ چھوٹے بھائی تبریز کی بیوی تھی' جو گھر کی اوپری منزل پر رہتا۔ اس کی تاکید تھی کہ امی کو کھانا وقت پر دو مگر جب وہ نہ ہوتا تو۔۔۔ خیر امی اس کی دست نگر بھی نہ تھیں۔ ابا ان کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گزرے تھے۔ تابندہ آتی تو خود ہی امی کا چولہا چوکی سنبھال لیتی۔ ورنہ سوکھے منہ بیٹھی رہتی۔ تبریز آتا تو رسمی حال احوال لے کر کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ مانو دونوں میاں' بیوی نے اپنی دنیا الگ بنا رکھی تھی۔ عرصہ ہوا تھا تبریز کو گھر اور گھر کے معاملات سے لاتعلقی اختیار کیے ہوئے۔ بڑا بھائی فیملی سمیت دبئی میں مقیم تھا۔ چھوٹی رخشندہ خالہ کے گھر بیاہ کر اسلام آباد گئی تھی۔ امی سے وہ ہر ممکن دامن بچاتی رہتی تھی۔

''مگر تابہ۔۔۔'' بات ان پر کھل ہی گئی۔ تب ہی گھنٹہ بھر اسے بیٹھ کر سمجھایا۔ زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے اور یہ کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ آج نہیں تو کل تنویر کو اچھی نوکری مل ہی جائے گی۔ مگر امی سے کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی بات سنی تھی' نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ تابندہ کیسے کہتی کہ حالات کی تنگی اور ذلت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ الماس کے مزاج کے سبب اس کا ایک ایک پل وہاں پہاڑ بن کے گزرتا ہے۔ اس پر مستزاد' تنویر کی مجرمانہ خاموشی۔ وہ آٹھ سالوں سے حالات بدلنے ہی کی تو



منتظر تھی۔ یوں میکے کی دہلیز پر آکر بیٹھنا ہوتا تو کاہے کو ولدر پہنچتی، امگرائی کہاں سنتی تھیں۔

تنویر سے تابندہ کی شادی تنویر کی یک طرفہ محبت کا شاخسانہ تھی۔ تنویر نے اسے راستے میں کہیں آتے جاتے دیکھا تھا اور پھر رشتہ لے کر امی کے پاس آپہنچا۔ تنویر تعلیم یافتہ، خوش شکل، مہذب، خاندانی تھا۔ امی کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اپنی شادی کے لیے اپنی ماں، بہن کی مخالفت کو واضح کرتے ہوئے اس نے بالا ہی بالا سارے معاملات طے کیے تھے۔ اگر جھوٹ بولا تو صرف اپنی جاب کے متعلق۔ شاید اس وقت خود اسے بھی امید تھی کہ اچھی جاب جلد یا بدیر مل ہی جائے گی۔

بعدازاں اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے تابندہ سے معافی مانگ لی تھی۔ وہ تابندہ کو پانے کے لیے کچھ جھوٹی سچی کہہ گیا تھا تو یہ اس کی چاہت ہی کہلائی جاسکتی تھی۔ مگر بات کہنے، میں صرف زبان ہلتی

ہے، جبکہ عمل میں ساری زندگی بھی رگڑی جا سکتی ہے۔ تنویر فطرتاً" سہل پسند اور شاہانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کا اندازہ تابندہ کو بہت جلد ہو گیا تھا۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ ساس کے حکم پر سسرال چلے آئے تھے اور تب اسے معلوم ہوا کہ تنویر کی شادی کے لیے ساس و نند کا اختلاف بجا ہی تھا۔ تنویر نے بھی ایک دھیلا کما کر ماں کے ہاتھ پر نہ رکھا تھا۔ سارا گھر الماس کی کمائی پر چلتا تھا جو اپنی مضبوط پوزیشن کی وجہ سے گھر بھر پر حاوی تھی۔ جب تک ساس زندہ رہیں، انہوں نے معاملات سنبھالے رکھے۔ الماس کی تنخواہ بھی ان ہی کے ہاتھ میں آتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بتیری کوشش کی کہ کسی طرح الماس ٹھکانے لگ جائے، مگر اس کے مزاج بہت اونچے تھے۔ خیر سے، بینک میں افسر تھی، کسی رنڈوے، دوہاجو کے لیے آمادہ بھی ہو جاتی تو کم از کم تعلیم یافتہ، باحیثیت تو ہوتا۔۔۔ مگر الماس جیسی ڈھلتی عمر، قبول صورت لڑکی کو بیاہنے کوئی اعلا گزیٹڈ آفیسر تو آنے سے رہا۔ سو ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ تنویر اعلا جاب یا کسی کاروبار کے خواب دیکھتا تو یہ خواب بھی پورے ہوتے نہ نظر آتے؟

اس کے مقدر میں لہو کے ہزار گھونٹ تھے، جو بیتے آٹھ سال گزرے تھے کہ ساس نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اسے صرف شکر کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔ وہ خود تو خاصی بے ضرر سی تھیں۔ جب تک حیات رہیں، ان پر ابر کرم بن کر چھائی رہیں۔ اس نے بھی ہمیشہ صبر و شکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا تھا۔ ان کی زندگی میں آٹے، دال کا بھاؤ معلوم بھی نہ ہوا تھا۔ شاید زندگی اسی خاموش سمجھوتے کی نذر ہو جاتی، اگر جو الماس کا چیختا چلاتا وجود نہ ہوتا۔ تنویر اسی رفتار بے ڈھنگی پر قائم تھا۔ انہوں نے الماس سمیت سب کچھ سنبھال رکھا تھا، مگر ساس کے گزرنے کے بعد تو جیسے حاکمیت ہی الماس کے تصرف میں آگئی تھی اور پل پل اسے کچوکے دینا اس کا چلن ٹھہرا۔ ماں کے گزرنے کے بعد تو وہ سب اس کے لیے بوجھ بن گئے تھے۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے رونا لے کر بیٹھ جاتی۔ تنویر کو برا بھلا کہتی۔ تابندہ میں کیڑے نکالتی۔ بچیوں کی جھوٹی سچی شکایتیں، وہ بھی علی الاعلان!

گو کہ گھر کا نظام اس نے ساس کی زندگی میں بھی سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہیں، حالات معمول پر رہے۔ اولاً" ہی انہوں نے تابندہ کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اگر عافیت درکار ہے تو الماس کے سامنے اف نہیں کرنی، ورنہ تم نہیں یا یہ نہیں۔ تابندہ آج بھی اس ہدایت پر کاربند تھی مگر۔۔۔

الماس کی لغت میں تسلی کا لفظ درج ہی نہیں تھا۔

وہ صفائی کی رسیا تھی۔ تعطیل کے دن اس کا سارا وقت صفائی دھلائی، جھاڑ پونچھ میں گزرتا۔ ایسے میں بچیوں کی معمولی سی کوتاہی بھی اسے آگ بگولہ کر جاتی تھی۔ فطرتاً" خاموشی و تنہائی پسند تھی، اسی حساب سے حد بندیاں تھیں۔ ٹی وی مت چلاؤ۔ اندھیرا رکھو، یہ وہ۔۔۔ تابندہ ہر ممکن احتیاط برتتی، مگر بچے پھر بچے ہوتے ہیں۔ بھولے سے بھی اس کے کمرے تک آجاتے تو پونی پکڑ کر باہر نکال دیتی۔ گھر کی ہر چیز پر اس کا قبضہ تھا اور یہ احساس کہ اس کی ملکیت ہے۔ تنویر کچھ ہاتھ لگتا تو کرلیتا، نہیں تو نہ سہی۔ اسے فکر بھی نہ تھی۔ روٹی تو چل ہی رہی تھی اور اس روٹی کی قیمت کتنی بھاری چکانی پڑتی تھی۔ یہ کوئی تابندہ کے دل سے پوچھتا۔

الماس کا پارہ ہمہ وقت آسمان پر رہتا تھا۔ کچن میں جاتی تو برتن اٹھا اٹھا کے پٹختی۔ ہر وقت در پردہ اسے سناتی رہتی تھی۔۔۔ طنز۔۔۔ ملامت۔۔۔ طعنے۔۔۔ اسے اپنے عہدے کا غرور، کمائی کا زعم تھا۔ ٹپ ٹاپ سے رہتی۔ شاہانہ زندگی گزارتی۔ آفس کی گاڑی میں ٹھسے سے بیٹھ کر جاتی۔ بچیاں ترستیں تو والدین کی تنگ دستی، دست نگر ہونے کے طعنے۔ تنویر کہتا کہ وہ شروع ہی سے ایسی ہے، جس کی جان کو آجائے، اس کا خون پی جاتی ہے۔ گویا اس معاملہ میں وہ خود کہیں قصوروار ہی نہ تھا۔

اسے ان سب کا ہنسنا‘ بولنا تک ناگوار گزرتا تھا۔
تنویر اپنی فیملی میں خوش رہتا تھا۔ مگر اس کا اپنا احساس کمتری عود کر آتا۔ یا یہ خلش سر اٹھاتی کہ یہ وہی تنویر تھا‘ جس کی نااہلی کے سبب اس نے اب تک گھر بھر کا بار اٹھائے رکھا اور جس نے شادی کا فیصلہ ان ماں‘ بیٹی کو پرے پھینک کر کیا تھا۔ وہ جیسے سرتاپا آگ بن جاتی۔ تابندہ کہاں تک سنتی۔۔۔ اس نے اپنی سلائی مشین جھاڑ پونچھ کر نکال لی۔ چند بچے ٹیوشن پر لگالیے۔ عرشیہ‘ فاریہ کے ساتھ پڑھادیتی مگر اس سے اتنا ہی ہوتا کہ روز مرہ کا خرچ نکل آتا۔ گھر کے بلوں کی ادائیگی‘ راشن‘ روزمرہ کی سبزی ترکاری‘ دودھ والے کا بل‘ یہ وہ۔۔۔ وہ تنخواہ پر مہینہ بھر کے لیے فریج بھر دیتی۔ تابندہ بچتی تو کہاں تک بچتی۔ گھر میں ہر چیز الماس کی لائی ہوئی تھی‘ اور اگر وہ کچھ لاتی تو اک نیا فساد کھڑا ہو جاتا۔ ممکن ہے‘ وہ چڑ کر بقیہ چیزوں پر پابندی لگادیتی۔ اس کی زندگی اور تنگ کردیتی طنز و ملامت کے ڈونگرے برسا برسا کر۔
الماس تو جیسی تھی‘ سو تھی‘ تنویر بھی چپ چاپ سنتا رہتا۔ بات گھوم پھر کر ہی تنویر کی کم حیثیتی پر آن رکتی تھی۔ اور بات اگر خود تک رہتی تب بھی گوارا تھی۔ مگر اب بچیوں پر منفی اثرات پڑ رہے تھے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی تھیں۔ وہ اسی چخ چخ سے بچنے کے لیے ہفتے کی شام میکہ آجاتی اور اتوار کی رات کو جاتی۔ مگر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کوئی کب تک بچ سکتا ہے۔ ٹکراؤ ہو ہی جاتا۔
اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے مزے سے ٹی وی دیکھتے ہوئے چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ جب فاریہ پہنچ گئی۔ وہ بچی ہی تو تھی۔ سو اس کی نظر ٹک گئی۔
"ہاں۔۔۔ لو کھالو۔۔۔ تمہیں بھلا کہاں نصیب ہوں گی امپورٹڈ چاکلیٹ۔" اس نے تلخی سے کہتے ہوئے چاکلیٹ تقریباً" فاریہ کے منہ میں ٹھونس ہی دی تھی۔ فاریہ روتی ہوئی لوٹی تھی۔ تابندہ کے دل کو ٹھیس لگی تھی۔

وہ اور تنویر چپ سے رہتے تھے۔۔۔ مگر بچیاں۔۔۔ اور اب اس نے ٹھان لی تھی کہ یہ اذیت و ذلت بھری زندگی اس کی بچیوں کا نصیب نہیں بنے گی۔ وہ محتاج ہے‘ نہ نااہل۔ اسے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔



اس صبح امی سودا سلف لینے گئیں تو اس نے بستر سمیٹ کر جلدی جلدی صفائی ستھرائی کی اور کچن کا کام نمٹایا۔ کچھ کپڑے دھلنے کو پڑے تھے۔ واشنگ مشین میں گھما کر نتھارے اور رسیوں پر پھیلانے کے بعد تخت پر سلائی مشین رکھ کر جھاڑ پونچھ کے بعد تیل ڈالا۔ نوکری اتنی جلدی تو ملنے سے رہی۔ تب تک کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔
"مما!" عرشیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔
"ہم گھر کب جائیں گے؟" وہ ایک حساس و ذمہ دار بچی تھی۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر تابندہ نے اسے نچلے درجے کے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا۔ ارادہ تھا کہ آمدنی کی سبیل بنتے ہی سب سے پہلے عرشیہ کو بہتر اسکول میں بٹھانا ہے۔ تابندہ نے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگا کر پوچھا۔
"عرشی بیٹا! اگر ہمیں ہمیشہ نانی کے گھر رہنا پڑے تو رہ لوگی؟"
"مگر کیوں مما!" اس نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا۔
"بیٹا! حالات بدلنے کے لیے انسان کو کبھی کبھی جگہ بدلنی پڑتی ہے۔ کچھ لوگوں کو چھوڑنا یا کبھی کسی کو اپنانا پڑتا ہے۔ مما جاب کریں گی تو ہماری مشکلات دور ہوں گی۔ ہم بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ آپ کو مما کا ساتھ دینا ہوگا‘ دوگی نا۔" وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی تھی‘ پھر کہا۔
"مجھے بس اپنی مما کے ساتھ رہنا ہے۔"
عرشیہ نے اس معصومیت سے کہا تھا کہ تابندہ کو اس پر ڈھیروں ڈھیر پیار آگیا تھا۔ اسے بازوؤں میں بھینچ

کر چٹا چٹ پیار کیا تو آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگنے لگے تھے۔



تابندہ کی ذات سے امی کو سو سکھ تھے۔ تب بھی وہ اسے بٹھا کے نہیں — رکھ سکتی تھیں۔ شاید وہ اس کی خاموشی کے عقب میں چھپے مفہوم کو جانچ گئی تھیں۔ اور معاملہ اندرونی ہو کہ بیرونی... وہ بے بس ہوتیں تو پہلی پکار عادل کو پڑتی۔ عادل بھی ایک ہی آواز پر لبیک کہتا بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوتا۔ اس بار بھی یہ ہی ہوا۔ اسی شام عادل آیا تھا۔ گھنٹہ بھر امی سے کھسر پھسر چلی۔ تابندہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے فاریہ کو فیڈر پلانے کے بعد عرشیہ کو تھپکیاں دے رہی تھی۔

عادل اس کا کزن ہی نہیں۔ اس کا رستار بھی تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی... مگر تابندہ نے انکار کر دیا۔ ہمیشہ سے عادل کا اس گھر میں عمل دخل تھا۔ وہ ساتھ کھیل کود کر پلے بڑھے تھے مگر اس نے عادل کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ خصوصاً گھر میں اس کے عمل دخل کے سبب اب شادی کی صورت میں دنیا کی زبانیں کھل سکتی تھیں اور اسے اپنا کردار اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا پھر عادل نے بھی کہا تھا کہ زبردستی کسی کو خود سے باندھ لینا محبت نہیں ہے۔ ہم اگر کسی کا ساتھ مانگیں تو اس کا پیار بھی میسر ہو۔ کیونکہ کسی کو پالینا محبت کی جیت نہیں بلکہ کسی کو اپنا بنالینا محبت کی جیت ہے۔

مگر وہ آج بھی اپنی محبت پر قائم تھا۔ امی کا خیال تھا کہ وہ عادل کی بات مانتی ہے۔ وہ اس کا خیال بھی اتنا ہی رکھتا تھا۔ ہمیشہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا۔ یہ اس کی محبت کی راستی نہیں تو اور کیا کہلاتی کہ وہ آج بھی تنہا تھا۔ اس تک آنے سے پہلے اس نے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ بجایا تھا اور پھر دیوار سے لگے سوئچ بورڈ کے بٹن کو کھٹ سے آن کیا تو سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تابندہ لب بھینچے عرشیہ کو تھپکتی رہی اور عادل اس کے سامنے بیٹھ کر تادیر افسوس بھری نظروں سے یوں تکتا رہا جیسے اسے تابندہ سے اس عمل کی توقع نہ ہو۔

"مجھے پتا ہے تمہیں امی نے بلوایا ہے کہ مجھے سمجھا بجھا کے میرے دماغ میں گھسا خناس نکالو۔" تابندہ کو کہنا پڑا۔

"اگر ایسا ہے بھی تو کیا حرج ہے۔ وہ تمہارا برا تو نہیں سوچتیں؟"

"انہوں نے اب تک میرا بھلا ہی تو چاہا ہے۔" اس کی آواز گمبھیر ہو گئی۔

"کیا تم جیسی سمجھ دار اور حوصلہ مند لڑکی کو یہ بتانا پڑے گا کہ نصیب سے ٹکرانا حماقت ہے؟"

"ہونہہ... نصیب! انسان اپنی خطاؤں کو نصیب کے کھاتے میں رکھ کر کس آسانی سے ہاتھ جھاڑ لیتا ہے۔"

"تم پھپھو کے لیے اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو۔ وہ ماں ہیں تمہاری؟"

"اور ماں ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ ناانصافی رکھی ہے۔" اس کے اندر کسی پرانے سسکتے آزار نے سر اٹھایا تھا۔

"اب جو وقت گزر گیا اس کی لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ اگر آج پر نظر رکھو تو..."

"میرا آج بھی امی کی بے پروائی کے سبب برباد ہے۔ تنویر کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یوں مجھے بیاہنے پر تل گئیں۔ جیسے میں روٹیاں زیادہ کھاتی تھی۔ اس نے جو جھوٹے سچے آسرے پکڑا دیے ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ پر کیا گزرے گی؟"

اب اگر عادل یہ جتاتا کہ وقت ہی ایسا چل رہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اور یہ کہ پھپھو نے مات اپنی سادگی سے کھائی تھی۔ وہ ہی نصیب کی کھوٹی نکلی ورنہ انہوں نے اس کا برا تو نہ چاہا تھا۔ تو تابندہ یقیناً چڑ جاتی اور عادل اس کے احساسات کی بہت پروا کرتا تھا۔ سو یہ ہی کہہ سکا۔

"راستے کی کٹھنائیوں سے ہار کر منزل چھوڑ دینے

سے بہتر ہے کہ کٹھنائیوں کو سہل کرنے کی تدبیر کرو۔"

"تم اسے نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں آتش فشاں ہے اور اس ایک عورت نے گھر بھر میں حشر ڈھا رکھا ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اس منحوس کی صبح ہو جاتی ہے۔ آتے جاتے 'طنز' ملامت' طعنے' اٹھا پٹخ' دست نگر ہونے کا عذاب' اس کی ذلت ہے۔ اس پر تنویر کی خاموشی و بے کاری۔۔۔ میں کم از کم اس کی طرح یہ ذلت نہیں سہہ سکتی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو' ذلت بھلا کسے گوارا ہوتی ہے۔ ویسے وہ جاب کرتی ہے تو گھر میں رہتی کتنے گھنٹے ہو گی؟"

"تم اسے دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ اسے پل بھر جھیلنا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ وہ ایک ایک چیز کی جو کسی کرتی ہے۔ ہر چیز میں تالا ٹھونک کے جاتی ہے' جیسے ہم چور ہیں۔ بچوں سے کرید کرید کر دن بھر کی روئیداد پوچھتی ہے' تاکہ کیڑے چن کر مجھے بے عزت کر سکے۔ صاف سیدھی بات ہے کہ اسے ہم سب سے پرخاش ہے۔ بس۔۔۔"

"اور تم ہار کر میدان چھوڑ دو گی؟ وہ لڑکی ہے' اس کے بیاہنے تک ہی صبر کر لو۔"

"ہونہہ! اب کیا بیاہے گی؟ آدھا چونڈا تو گھر بیٹھے ہی سفید ہو گیا ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ جوڑ تو اللہ نے سب کا بنایا ہے اور شادی کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"اگر اس کے غارت ہونے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو مجھے یہ قدم نہ اٹھانا پڑتا۔ مگر لگتا ہے وہ اس گھر سے ایک انچ ہلنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنا معیار اتنا بڑھا رکھا ہے کہ کم از کم اس روئے زمین پر تو ایسا شہزادہ نصیب ہو نہیں سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے اس کی نظریں مکان پر ہیں۔ یا وہ ہمیں اتنا زچ کر دینا چاہتی ہے کہ ہم میدان چھوڑ بھاگیں اور میں یہ بھی کر گزرتی' اگر تنویر ناکارہ ثابت نہ ہوتا تو۔۔۔"

"تابی! کوئی انسان صد فیصد اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہوتا۔ الماس جیسے لوگوں کو خود کار دکیے جانا بھی غصہ میں مبتلا کرتا ہے۔ تم نے بھی اس کے اندر اتر کر اس کے آزار جانچنے کی کوشش کی؟ اس کے قریب ہو کر۔۔۔"

اس بار وہ سچ مچ چڑ اٹھی۔ وہ بھلا کیوں اس کی جوتیاں سیدھی کرے۔ سچ تو یہ تھا کہ کوئی تعلق بنتا ہی نہ تھا۔

"میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے عادی! مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ ہر کسی کے آگے پیچھے پھر کر اس کی تیوری سیدھی کرنے کی کوشش میں لگی رہوں۔ میں بھی انسان ہوں۔ میری بھی کوئی عزت ہے۔"

"تابی! وقت کیسا بھی برا ہو بدلتا ضرور ہے۔"

"تب تک میں پاگل ضرور ہو جاؤں گی یا پھر خودکشی کر لوں گی۔" وہ کچھ دیر لب بھینچے' کچھ سوچتا رہا' پھر کہا۔

"چلو اس تکرار کا اتنا تو نتیجہ نکلا کہ تمہیں کم از کم تنویر سے کوئی شکایت نہیں ہے اور یہ ہی سب سے اہم نکتہ ہے۔"

"اس کی خاموشی ہی اس کی کمزوری ہے' جو اس کی بے کاری کے سبب ہے عادل! الماس کی زبان اگر تالو سے چپک کر رہ جائے تو بھی کسی کے ٹکڑوں پر پلنے کا احساس کم جان لیوا نہیں ہوتا۔ کبھی جاب تو تنویر کو ملنی ہے' نہ ملے گی۔"

"تو جاب کو گولی مارو۔ کسی کاروبار کے لیے قرضہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ میں ہوں نا۔۔"

"خدا کے واسطے عادی! میں ویسے ہی تمہاری بہت زیر بار ہوں۔ اب تنویر کو بے ساکھی پکڑ کر چلنا مت سکھاؤ۔"

"اگر تم نے جاب کا فیصلہ کیا ہے تو میدان چھوڑنے کی کیا تک بنتی ہے؟"

"جب کما کے بھی مجھے ہی کھلانا ہے تو اس کے نام کا لیبل بھی کیوں چپکا کے رکھوں؟ میری بچیاں کیوں محرومی کی زندگی گزاریں' جبکہ میں انہیں اچھی زندگی دے سکتی ہوں۔ بی اے کیا ہے میں نے۔"

"مجھے پتا ہے تم دے سکتی ہو۔ مگر تم سے یہ کس نے کہا کہ پیسہ ہر محرومی کا ازالہ بن سکتا ہے؟" یہ پہلی بار تھا کہ تابی نے کسی معاملہ میں اتنی دیر حجت کی ہو۔

"جن کے باپ نہیں رہتے' وہ بھی تو زندہ رہتے ہی ہیں۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔ "اگر امی کو میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں انہیں لے کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔"

"اچھا۔۔۔" وہ مسکرایا۔ "مثلاً" کہاں؟"

وہ لاجواب ہوئی تو لب بھینچ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد کہا۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"میں نے تو صرف ٹھکانہ پوچھا ہے۔"

"کہیں بھی۔۔۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر اللہ نے کچھ حدود بھی تو بنائی ہیں' عورت کے لیے۔ وہ بے سہارا ہو جائے تو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ دنیا مجبور عورت کی ضرورت کو کیش کرتی ہے۔ تم کہاں تک بچو گی۔ عورت لوہے کی بھی ہو' رہتی تو عورت ہی ہے نا۔ تابندہ! جہاں کئی زندگیاں تمہارے ساتھ جڑی ہوں' وہاں زندگی کے فیصلے از خود نہیں کیے جاتے۔ تمہارے ایک فیصلے سے کیا کچھ بگڑے گا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ مجھے تمہاری کسی بھی خوبی سے انکار نہیں ہے۔ مگر کسی بھی فیصلے سے پہلے مڈل کلاس کے کچھ ان گھروں پر نظر ضرور ڈالنا جہاں بیاہی بیٹیاں کسی بھی وجہ سے اجڑ کر آ بیٹھتی ہیں' ہر جگہ نہیں تو اکثر و بیشتر تمہیں اک نفسا نفسی ضرور نظر آئے گی۔ پروردگار نے مرد و عورت کے ذمہ مختلف ذمہ داریاں رکھی ہیں۔ عورت کو صنف نازک بنایا' اسی حوالے سے اسے فرائض بخشے ہیں۔ یہ عورت جب کسی بھی وجہ سے دہری ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتی ہے تو تھک کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ مرد کی بے کاری اور عورت کی بربادی عموماً" فرسٹریشن بن جاتی ہے۔ یہ فرسٹریشن منفی رخ پر چل پڑتی ہے تو آس پاس کے لوگ زیر عتاب ضرور آتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔ کیا تم خود کو کسی رسک پر رکھنا چاہو گی؟"

تابندہ کی آنکھیں پھیل کر سکڑی تھیں۔ جیسے پل کے ہزارویں حصے میں کسی سسکتے آزار نے سر اٹھایا۔ اس کا ایک ایک لفظ جیسے تابندہ کے اندر اترتا جا رہا تھا۔

"بات تلخ سہی' مگر سچ ہے کہ تنہا عورت کا دگنا بوجھ اٹھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ ہارتی نہیں تو تھک ضرور جاتی ہے اور یہ تھکن ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتی ہے۔ میں تمہیں اسی ٹوٹ پھوٹ سے بچانا چاہتا ہوں۔"

عادی کی بات راست ہی تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں جیسے اسے کہیں دور لے گئی تھی۔ یہ کوئی خلش نہ تھی۔ بس اک ان کہا سا بوجھ جو جانے کب سے اس کے دل کو مٹھی میں لیے ہوئے تھا۔

ہوتا ہے نا! بعض چیزیں انسان کے اندر پلتی پنپتی ہیں۔ سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر وہ ان کے وجود سے بھی خبر رہتا ہے۔ یہ بھی اک ایسا ہی آزار تھا۔

عرشیہ سو چکی تھی۔ عادل نے چلتے ہوتے کھٹ سے بٹن بند کر دیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا اور جیسے ماضی جاگ گیا۔



جانے کتنے سالوں کی بات تھی۔ ابا کی وفات ہونے کے بعد اماں اکیلی رہ گئی تھیں۔

پھر گھر بھر کی دہری ذمہ داری امی کے ہی کاندھوں پر آپڑی۔ مگر دنیا کو اک ٹارگٹ نصیب ہو گیا تھا۔ تنہا' جوان' خوش شکل عورت' ہر کوئی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر تل گیا تھا۔ پڑوس کے انکل جمیل اکثر بہانوں سے اپنی چھت سے ان کے گھر جھانکتے۔ امی خاطر میں نہ لاتیں۔ مگر خائف ضرور رہتیں۔ پھر اک روز وہ گھر کے دروازے پر چلے آئے۔

"کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بتایئے گا۔" امی ان کی تاک جھانک سے برگشتہ تھیں۔ مگر نرمی ہی میں عافیت تھی۔

"آپ بس اپنی فکر رکھیے۔ ہماری فکر چھوڑ دیجئے۔"

"فکر کیوں نہ کریں۔ دونوں گھروں کی دیوار ملی ہے۔ پڑوس کا بڑا حق ہوتا ہے۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ ضبط کا کڑوا گھونٹ بھر کر بھی بول اٹھیں۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"بس اتنا کہ آپ ہمارا خیال رکھیے' ہم آپ کا رکھیں گے۔" وہ مونچھیں مروڑنے لگے۔

اسے یاد تھا' امی کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑ گیا۔ انہوں نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ مگر پھر ادھر سے کھٹا کھٹ پتھر آنے لگے۔ امی لرزتی کانپتیں۔ مگر بہرحال چار بچوں کی ماں تھیں۔ سوچتیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج سکتی۔ آخر کار ان کے حوصلے پست ہو ہی جائیں گے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ٹھہرا۔

وہ جھلستی گرمیوں کے دن تھے۔ رات میں لائٹ جاتی تو امی چارپائیاں صحن میں ڈال کر وہیں بچوں کو کھانا کھلاتیں۔ چارجنگ لیمپ جلا کر اسکول کا کام مکمل کرواتیں۔ بچے سو جاتے تو بعد میں انہیں اٹھا کر اندر لے جاتیں۔ اس دن بھی یہ ہی ہوا تھا۔ جب وہ سب صحن میں اپنے کھٹولوں پر سو رہے تھے۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا' اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ امی نے کپکپاتی آواز میں ان کو جگایا تھا۔

"بارش ہو رہی ہے' جلدی اندر چلو۔" وہ سر سے پیر تک لرز رہی تھیں۔ تیزی سے سب کو اندر لے جا کر کنڈی تالے ٹھونک دیے۔ صبح پتا چلا کہ انکل جمیل ان کے گھر کود گئے تھے۔

مگر امی نے ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہا۔ کیچڑ میں پتھر پھینکو تو چھینٹیں خود پر ہی آتی ہیں۔ بس انہوں نے خود کو محدود کر لیا تھا۔ پھر سڑی گرمی میں بھی امی کنڈی تالے لگا کر رکھتیں۔ بچوں کو مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ کر رکھتیں۔ انہوں نے گلی محلے میں بچوں کا کھیلنا تک بند کر دیا تھا۔ بس اسکول' ٹیوشن اور گھر۔ خود بھی تقریباً" قطع تعلق کر لیا اور لوگ کہتے کہ پیسے کی گرمی ان کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ مگر انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ گھر کے کاموں کا بہانہ کر دیتیں۔ وہ بچوں کو اسکول لینے جاتیں تو واپسی میں سودا لیتی آتیں۔ اسکولز' بینک' بلز' راشن کی لمبی قطاریں' یہ وہ... ان دہری ذمہ داریوں کے بوجھ سے جیسے وہ سر تاپا تھکن میں ڈوب گئی تھیں۔ اس تھکن نے انہیں توڑ ڈالا تھا۔

تابندہ نے ایک تکلیف دہ بچپن گزارا تو امی کے مزاج کی گرمی کی بدولت۔ وہ کچن میں کھڑی ہو جاتیں تو یا وہ آسمان کو چھوتا۔ پاس پڑی تیلی اٹھانے کے لیے بھی پر جلال آواز تابندہ کو پڑتی۔ وہ لرزتی کانپتی دور سے دوڑ کے آتی۔

"کہاں مر گئی تھی... اتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔ جب تک میں کام کر رہی ہوں' یہیں کھڑی رہ۔"

وہ کچن کی دیوار سے لگی دھوپ میں کھڑی رہتی۔ بہن' بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے زیادہ زیر عتاب آتی۔ ان کا چڑچڑاپن' غصہ' بد مزاجی' وہ پتے کی طرح لرزتی رہتی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی امی کا دھاڑنا شروع ہو جاتا۔

"شہزادی! اٹھ جا... تیرے باپ کی نوکر نہیں لگی ہوں۔" چھوٹی سی عمر میں امی نے اس پر ڈھیروں دفعات لگا رکھی تھیں۔ وہ علی الصبح جاگ کر اپنے ساتھ بہن' بھائیوں کے بھی کپڑے پریس کرتی۔ اولاد کے لیے نرمی یا چھوٹ کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا۔ آج بھی وہ اس وقت کو یاد کر کے لرزتی تھی۔ امی کے اندر جیسے آگ بھڑکتی تھی۔ دہری ذمہ داری کا بار' تنہائی' جذباتی نا آسودگی اور دنیا... مانو کوئی خنجر تھما دے تو کسی ایک کو گھونپ دیں۔

اک بار انہوں نے تبریز کا سر دیوار میں ٹکرا ٹکرا کر مارا۔ "تو مر جائے تو اچھا ہے' میں اکیلی جان کیا کیا کروں؟" تبریز کو بخار تھا۔ اس کا دل آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ وہ یوں ہی بچوں کو کوستی نظر آتیں۔

"پورے چار ہیں' گنتی کے چار' اک آدھ کم بھی نہیں ہوتا۔" اس وقت وہ یہ ہی سمجھتی کہ ماں کو ان سب سے نفرت ہے۔ وہ ابا کو یاد کرتی جو کتنا پیار کرتے تھے۔ ان کے لیے قیمتی سامان' کھلونے' چاکلیٹس لاتے۔ محلے میں ابا کی دھاک تھی۔ مگر اب ان کا کون دفاع کرتا۔ امی کہتیں۔ اب تمہارا باپ سر پر نہیں بیٹھا ہے۔ گلی میں کھیلو گے' کسی سے ملو گے تو شکایتیں بھی آئیں گی۔

امی نے اسے دوپہر کی شفٹ میں داخل کروادیا۔ وہ صبح کا سارا کام کرکے بارہ بجے سدھارتی' شام کو لوٹ کر یونیفارم اتارتے ہی گھر کے دھندوں میں لگ جاتی۔ مگر انہیں اپنا غبار نکالنے کا موقع مل ہی جاتا۔ بس نہ چلتا' اس کے منہ میں جاتا نوالہ تک چھین لیں۔ بیماری ان کے نزدیک جھوٹ ڈھونگ تھی اور پڑھائی بہانہ۔

"تجھے نہیں پتا ابھی کتنے کام پڑے ہیں' تو بک کھول کر بیٹھ گئی۔" اکثر وہ ہاتھ میں پکڑی چیز اس کو کھینچ مارتیں۔ وہ چٹنی مسالا پیستی تو ہاتھوں میں آگ لگ جاتی' مگر پروا کسے تھی۔ عذر دے کر بھی کام کرنا ہی پڑتا۔ امی کو چوں بھی منظور نہ ہوتی تھی اور فرمائش' لاڈ و نخروں کے تو وہ چاروں معنی بھی بھول گئے تھے۔ ان کا پکایا بچوں کے منہ کو نہ لگتا تو بھی پروا کسے تھی۔

"کھانا ہے تو کھاؤ' ورنہ بھوکے سو جاؤ۔" کئی بار تو بچ کوئی نہ کوئی بھوکا ہی سو جاتا۔ امی ہر معاملہ میں من مانی و ہٹ دھرمی کی عادی ہو گئی تھیں۔ شاید اسی کو عورت ذات کی تریاہٹ کہتے ہیں۔ مگر یہ تریاہٹ۔ بے سبب نہیں ہوتی۔



گھر کے عقبی حصہ میں ابا کے ہاتھ سے لگایا اک چھوٹا سا باغ تھا۔ آم پپیتے اور امرود کے درخت گھر سے متصل سڑک سے نظر آتے۔ اک روز اک مناسب قدوقامت کا بھوری آنکھوں والا گورا چٹا آدمی دروازے پر چلا آیا۔

"سلام بی بی صاب!" سندھی ٹوپی لگائے' اجرک کی بکل مارے عجز و انکسار کا پیکر۔ وہ سانول تھا۔ جو ہاتھ جوڑے درخواست گزار تھا۔

"اس باغ کا پھل ہم کو بیچ دو بی بی صاب! ہم اس باغ کی گوڈی کرے گا۔ پانی دے گا۔ جب فصل تیار ہوگی تو منڈی بیچ کر آئے گا۔ آدھا منافع آپ رکھنا۔"

امی کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اجڑا باغ بیٹھے بٹھائے آمدنی دینے جا رہا تھا۔ ابا کے بعد اس باغ کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سانول نے اپنی محنت سے باغ میں جان ڈال دی تھی۔ اس باغ کی دیکھ بھال میں وہ صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ کبھی تھک کر ہانپتا تو کسی درخت سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ امی اسے ٹھنڈا پانی' کبھی شربت گھول کر بھیج دیتیں۔ کبھی دیر سویر ہو جاتی تو بلا کے کھانے کی ٹرے پکڑا دیتیں۔ اک روز وہ امی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"ایک بات بولوں بی بی صاب! آپ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔ مجھ سے دو وقت کی روٹی کے صدقے ہزار کام کروالو۔ بس کھانے' پینے کا آسرا کردو۔"

امی مسکرا دیں۔ وہ فطرتاً" نیک طبع تھیں۔ بے چارہ سانول پردیس میں۔ بے گھر تھا۔ وہ اسے اندر بلا کے کھانا کھلانے لگیں۔ ڈھیروں کام سانول نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ بچوں کو اسکول سے لے آتا۔ کسی نہ کسی بچے کو کندھے پر لاد کر سودا سلف لادیتا۔ کبھی کوئی بیمار پڑتا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ مانو اک خاموش معاہدہ۔

امی اب کھانا پکاتیں تو سانول کی پسند ناپسند کا خیال رکھتیں۔ وہ امی کے ہاتھ کے ذائقہ کی تعریف کرتا۔ پھر بات ہاتھ کے ذائقہ سے' ہاتھ کی تعریف پر آگئی۔ تابندہ کا خیال تھا۔ امی اسے جوتے مار کر نکال دیں گی مگر امی اب خوش رہنے لگی تھیں۔ وہ سانول کا انتظار کرتیں۔ اس کے پسندیدہ کھانے' پکاتیں اور بجتی سنورتیں۔ مانو اک چھوٹی سی بے ایمانی۔ جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ بس تسلی تھی' سہارا تھا' شاید آسودگی۔

وہ کھل اٹھتیں۔ جب وہ امی کو سراہتا' یا یہ کہتا کہ وہ شخص بہت خوش نصیب تھا۔ آپ جس کا نصیب تھیں۔ شاید وہ اسی ستائش کے لیے خود کا خیال رکھنے لگی تھیں۔

اس بار وہ دنیا سے بھی بے پروا ہو گئی تھیں۔ سانول کسی کام سے گاؤں گیا تو کئی سوغاتیں لایا۔ ستو' دھنیے کا تیل' اچار اور ساتھ میں امی کے لیے سندھی کڑھائی سے بجی چادر۔

پھر وہ امی سے ابا جیسی فرمائشیں کرنے لگا۔ یہ رنگ پہنو' یہ نہ کرو۔ وہ کرو' امی بھی ہر چھوٹی بڑی بات اس

سے کرنے لگیں۔

"کل ہم شادی میں گئے تھے' میں نے نیلی ساڑھی باندھی۔"

"اوہ! نیلا رنگ تو تم پر بہت بجتا ہے۔" وہ امی کو اس بے تکلفی سے پکارتا تو یہ حوصلہ ان ہی کا بخشا ہوا تھا۔

"ہاں.... سب یہ ہی کہہ رہے تھے۔"

"مگر میں نے تو نہیں دیکھا نا۔"

پھر اگلے روز امی نے اسے نیلی ساڑھی باندھ کر دکھائی۔ بچوں کے اسکول سے شکایتیں آنے لگی تھیں۔ امی کی توجہ اب گھر اور بچوں سے ہٹ رہی تھی۔ مگر سانول نے ان کی تھکن بانٹ لی تھی۔ وہ مطمئن ہوگئی تھیں اور شاید آسودہ بھی۔ جانے کتنے دن گزرے۔ پھر سانول کے گھر سے بلاوا آگیا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ سانول حساب کتاب کر کے چلا گیا۔ پھر نہ لوٹا۔ جانے امی نے اسے یاد کیا نہ کیا۔ کب' کب اور کہاں' کہاں اس کی کمی محسوس کی یا نہیں کی۔ مگر دنوں میں جیسے سب کچھ بدل گیا۔ شاید پہلے جیسا ہوگیا۔ یا پھر پہلے سے بھی بہتر.... کیوں' کیسے اور پتا نہیں' وہ منٹوں میں جیسے سالوں پیچھے کی سیر کر آئی تھی۔

عادل کا ارمان بجا تھا۔ بار.... تھکن.... ٹوٹ پھوٹ.... یہ لفظ اس کے لیے نئے نہ تھے۔ وہ خود ان کا عذاب اپنی جان پر جھیل چکی تھی۔ دہری ذمہ داریوں کا بار اٹھانے میں عورت تھک کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس کی اپنی ذات ختم ہوجاتی ہے' اندر خلا رہ جاتا ہے تو محرومی عود کر آتی ہے۔ یہ ناآسودگی' تھکن' اسے آتش فشاں بنا دیتی ہے۔ جو پھٹتا ہے تو آس پاس کے لوگ زیر عتاب آتے ہیں۔

الماس.... امی اور وہ خود....

ایک ہی کہانی کے تین رخ تھے۔

الماس کی چیخ پکار امی کی بے ایمانی' تابندہ کا فیصلہ محرک ایک ہی تھا' محرومی۔

اسے الماس نہیں بننا تھا اور کسی بے ایمانی کا تو وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ اسے لوٹنا تھا۔ صبر شکر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار ہی نہیں کرنا تھا' الماس کے اندر اتر کر اس کی محرومیوں کو بھی ٹٹولنا تھا۔ ممکن ہے سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے۔

یہ اس کا فیصلہ تھا۔



فرح بخاری

شامِ خزاں طویل سہی

ہوائی جہاز علامہ اقبال انٹرنیشنل ایرپورٹ لاہور پر لینڈ کرنے والا تھا۔ عازم نے عینک بند کر کے جیب میں پھنسائی اور کتاب بند کر کے ہینڈ بیگ میں ڈال لی۔

سارہ نے بالکل اچانک ہی زوردار طریقے سے اس کی کلائی تھامی۔ جس پر پہلے تو عازم — چونکا لیکن پھر مسکراتے ہوئے خود ہی اس کی نرم انگلیاں اپنے ہاتھوں میں پھنسالیں، وہ آنکھیں بند کیے کسی ورد میں مگن تھی۔ ہمیشہ سے اسے لینڈنگ کے مرحلے سے خوف آتا تھا۔ جب جہاز کے پہیے ایک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑتے تو اسے لگتا ابھی یہ پھٹ جائیں گے اور ان میں آگ لگ جائے گی اور پھر ایک زوردار دھماکا...

”ہمیں لینے کون آرہا ہے...؟“ سارہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت سامان کے انتظار میں کنویر بیلٹ کے قریب کھڑے تھے۔

”یقیناً“ عرفان بھائی آئیں گے۔“

”اوہ... میں نے سوچا اب ان کی نئی جاب ہے کیا پتا شیڈول وغیرہ چینج ہو“

”ہوں...“ عازم نے مختصر جواب دے کر آتے جاتے سامان پر نظر ڈالی۔

”کیا بات ہے عازم! آپ بہت چپ چپ ہیں۔ حالانکہ آپ تو وطن آنے کے لیے برسوں بے چین رہے ہیں اور بالآخر ہم ہمیشہ کے لیے آہی گئے۔ یا پھر آپ پچھتا رہے ہیں جاب چھوڑ کر...؟“ سارہ نے پورے سفر کے دوران محسوس کیا کہ اس بار عازم کے انداز میں وہ ہمیشہ والی شوخی اور جوش مفقود ہے۔ وہ تو

مکمل ناول





جہاز کے سفر میں بے تکان بولنے کا عادی تھا۔ جبکہ یہ پہلا سفر تھا، جو عازم نے سوتے اور کتاب پڑھتے گزارا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" اس نے فوراً" سارہ کا خیال رد کیا۔ "وطن واپس آنا میرا خواب تھا، جو الحمدللہ آج پورا ہو گیا ہے اور میں بہت خوش بھی ہوں۔ بس فیوچر کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ آگے بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"نہیں، کیا کرنا ہے فیوچر کے بارے میں سوچ کر۔" سارہ نے اداسی سے آہ بھر کر کہا تو عازم نے ایک نظر اسے دیکھا اور توجہ دوسری جانب مبذول کر لی۔

باہر نکلے تو اپریل کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا نے استقبال کیا۔ جانی پہچانی مہک کو نتھنوں میں محسوس کرتے ہی عازم کے لب مسکرا اٹھے۔

"کیا بات ہے اپنے وطن کی... اور پھر لاہور کی...! وطن کی زمین پر پڑنے والے پہلے قدم ہمیشہ ہی اسے بڑے جادوئی اثر لگتے۔ "پتا نہیں کیا ہے اس مٹی میں... زندگی تو بس یہیں محسوس ہوتی ہے۔" عرفان بھائی نے ہاتھ ہلایا تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور بھائی کے گلے لگ گیا۔ سارہ سے سلام دعا کا تبادلہ ہوا پھر وہ ٹرالی اس سے لے کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئے۔

"بہت دبلے ہو گئے ہیں عرفان بھائی۔"

"بس یار... فیلڈ کا کام تو خون بھی نچوڑ لیتا ہے، ہماری تو ابھی چربی کم ہوئی ہے۔" وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بیگز گاڑی میں ایڈجسٹ کرنے لگے۔

"چلو تم آگے آجاؤ... بھابی! یہ چھوٹا بیگ آپ اپنے پیروں میں رکھ لیں۔" وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔

"موسم تو بہت زبردست ہے آج۔" عازم نے باہر جھانکا۔

"ہاں، بارش کی پیشن گوئی بھی ہے شاید... فضہ بتا رہی تھی۔" عرفان نے گاڑی پارکنگ ایریا سے نکالی۔

"اماں کی طبیعت اب کیسی ہے...؟"

"بہتر ہے پہلے سے، اب تم آگئے ہو امید ہے، بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" عرفان نے محبت سے بھائی کو دیکھا، وہ بھی مسکرا دیا۔ گاڑی اب رنگ روڈ پر رواں دواں تھی۔



"اف...!" وہ تھک کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھی۔ چار بجے کالج سے آنے کے بعد دل چاہتا گھر پہنچتے ہی کوئی گرم چائے کا کپ سامنے حاضر کر دے، لیکن یہاں کے ماحول میں ایسی خواہش تو بس ایک خواب تھا۔ اماں ان بے جا چونچلوں کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ خزران نے زبردستی اپنا ذہن چائے سے ہٹایا۔ پرس الماری میں رکھ کر پہلے کپڑے تبدیل کیے پھر لاؤنج میں آکر بچوں کو آواز دی اور وہ سیکنڈز میں سامنے آکھڑے ہوئے۔

"ماما! آپ آگئیں..." مناہل اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"تم لوگوں نے پھر کپڑے چینج نہیں کیے... بری بات ہے بیٹا!" خزران نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ مناہل اور رافع کی نئی کلاسز ابھی پانچ روز پہلے شروع ہوئی تھیں۔ اماں نے بس پہلے دو دن ہی ان کا خیال رکھا تھا۔

"دادی نے کہا خود تبدیل کر لو... لیکن مجھے تو گھر والے کپڑے ملے ہی نہیں۔" رافع نے بیڈ پر چھلانگ لگائی۔

"اچھا کوئی بات نہیں... چلو نہا کر صاف کپڑے پہن لو... پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ دیکھو! ماما کا بھوک سے برا حال ہے۔" اس نے جلدی جلدی تولیہ اور کپڑے نکال کر رافع کو باتھ روم میں دھکیلا۔ کھانے کے دوران وہ دونوں مسلسل اسے نئی کلاس، نئی ٹیچرز اور نئے دوستوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔

"خزران... کھانا کھا لیا...؟" اماں نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی، تو وہ فوراً" دوپٹے سے ہاتھ

صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم لوگ کھانا ختم کر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلے جانا، خبردار جو تائی کے کمرے میں اودھم مچایا۔" وہ انہیں تنبیہہ کرتی اماں کے کمرے میں آ گئی۔

"جی اماں! کھانا کھالیا ہے۔ آپ کو کچھ چاہیے؟"

"ارے، دو گھنٹوں سے اپنی عینک ڈھونڈ رہی ہوں' قرآن پاک سامنے رکھا ہے' دیکھو کیسی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ جاؤ ذرا گاڑی کے ڈیش بورڈ پہ دیکھو! صبح میں آصف کے ساتھ بینک گئی تھی۔ شاید وہیں بھول آئی ہوں۔"

"جی اماں ...!" وہ فوراً پورچ میں آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ڈیش بورڈ تو کیا اوپر نیچے' آگے، پیچھے پوری گاڑی کھنگال ڈالی لیکن عینک ہوتی تو ملتی۔ وہ پیشانی پونچھتی بمشکل سیدھی ہوئی کہ مین گیٹ کی بیل بجی۔ وہ اس وقت گیٹ کے بالکل قریب تھی' اس لیے خود ہی آگے بڑھی۔

"کون...؟"

"میں... عازم حیدر!" ٹھہرے ٹھہرے پُرسکون لہجے پر وہ بری طرح چکرا گئی۔ ہر ڈیڑھ' دو سال کے وقفے کے بعد یہ مانوس آواز یونہی اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے گھبرا کر دوپٹا سر پہ لیا اور نہایت شرمندگی سے ایک نگاہ اپنے حلیے پر ڈال کر بدقت تمام چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم ...!" وہ ایک اڑتی پڑتی نگاہ عازم پر ڈال کر ایک طرف ہو گئی۔

"وعلیکم اسلام" ۔ وہ اس کے حلیے پر گہری نگاہ ڈالتا' بہت سے سوال دل میں لیے حیران حیران سا اندر بڑھ گیا۔ خزران گیٹ بند کر کے پلٹی اور اسے اپنی معیت میں ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ اس نے اماں کو اس کی آمد کا بتایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بچے پتا نہیں کہاں بھاگ گئے تھے۔

وہ کھوئی کھوئی سی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ عازم اس کا سگا پھوپھو زاد تھا یوں تو سا تھ، منگیتر بھی... لیکن اس کی سسرال میں دوسرے تعلق سے سب ہی ناواقف تھے' کیونکہ اس کی اور عازم کی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس گھر کے بڑوں نے آپس میں کہہ رکھا تھا۔ عازم کا خزران کے سسرال میں آنا جانا لبنیٰ بھابھی کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ عازم اور لبنیٰ بھابھی کا بھائی حمزہ ملائشیا میں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ عازم جب بھی چھٹی پر آتا تو حمزہ اس کے ہاتھ لبنیٰ کے لیے تحائف وغیرہ بھیج دیا کرتا اور یوں ہر ڈیڑھ دو سال بعد عازم کا ایک بار ضرور اس طرف آنا ہوتا۔ خزران نے کبھی اس کی آمد کو ناگواری یا شک کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ عازم پر بھروسا بہت پرانا تھا۔

"عازم کو میرے حالات کا علم تو ہو گیا ہو گا۔ سنجیدہ پھپھو اور فضہ بھابھی نے اسے بتایا تو ہو گا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہا ہو گا وہ یہ سن کر... میری حالت پر رحم... یا پھر بے حد غصہ' کہیں وہ اپنے غصے کا اظہار اماں کے سامنے نہ کر بیٹھے۔ وہ اضطراری کیفیت میں پیر کے انگوٹھے سے قالین کھرچے جا رہی تھی۔

"مما! آپ کو لبنیٰ تائی بلا رہی ہیں۔" رافع نے کمرے میں جھانک کر کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈرائنگ روم سے اماں اور عازم کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کچن میں داخل ہو گئی۔

"آؤ بھئی... ایک تو صبح سے سر میں درد ہے۔ اوپر سے مہمان کی خاطر مدارت بھی مجھے کرنا پڑ گئی۔" لبنیٰ کی اکتاہٹ پر خزران کو حیرت تو بہت ہوئی کیونکہ عازم ان کی وجہ سے یہاں آتا تھا اور ان ہی کا مہمان تھا لیکن بہرحال اس نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

"اچھا خیر... یہ دوسری ٹرے تم لے آؤ۔ میں چائے لے جا رہی ہوں۔"

"تم تو ہمیشہ کے لیے واپس آ گئے۔" اماں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

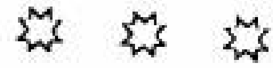
"جی بس... بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ یہاں آئے بنا نہیں ہو سکتے تھے۔"

"کام دھندے کے متعلق کیا سوچا ہے؟" اماں نے

اگلا سوال داغا۔

"پہلی ترجیح تو جاب ہے۔ آسانی سے چند ماہ کے اندر مل گئی تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ کچھ بزنس وغیرہ کا سوچوں گا۔"

اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے خوب فرصت سے خزران کو دیکھا لیکن وہ نظر چرا گئی۔ لبنیٰ بھابھی ٹرے رکھ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں، لیکن خزران چائے دے کر کے لاٹ گئی۔



بچے ٹی وی دیکھتے دیکھتے نو بجے سے کچھ پہلے ہی سو گئے۔ وہ شکر کرتی اٹھ گئی۔ صبح کے لیے کپڑے تو پریس کرنے نہیں تھے، کیونکہ آج ویک اینڈ تھا۔ خزران نے سوچا تھوڑا سا کالج کا کام ہی دیکھ لے۔ کچھ نئی کلاسز اسے دی گئی تھیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ نوٹس تیار کر لے۔ کتابیں وہ ساتھ اٹھا لائی تھی۔

سب بھی ترتیب سے رائٹنگ ٹیبل پہ رکھ کر وہ کمرے سے نکلی کہ اگر اماں جاگ رہی ہیں تو پوچھ لے، انہیں کوئی ضرورت تو نہیں۔ لیکن ان کے کمرے کی بند لائٹ دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ سو چکی ہیں۔ آصف بھائی اور لبنیٰ بھابھی کے کمرے سے البتہ ابھی تک بچوں کے شور کی آواز آرہی تھی۔ اس نے لاؤنج کی فالتو بتیاں بجھا کر صرف ایک جلنے دی۔ فون کی گھنٹی نے ماحول کی خاموشی توڑی تو اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا تاکہ اماں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

"ہیلو...!" خزران نے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو... کون ہے؟" کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ بولی۔

"ہوں... اپنی تصدیق کر رہا تھا کہ تم ہی ہو۔" عازم کی سنجیدہ آواز ماؤتھ پیس میں ابھری تو خزران کا دل بیچ بچ ڈوب کر پسلیوں میں چلا گیا۔

"سب سو رہے ہیں عازم!" اس نے بمشکل آواز نکالی۔

"اچھی بات ہے... زیادہ تسلی سے بات ہوگی۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

"لیکن مجھے کوئی بات نہیں کرنی... آصف بھائی یا لبنیٰ بھابھی میں سے کوئی یہاں لاؤنج میں آگیا تو...؟"

"دیکھو! گھر کا نمبر میں نے بھی مجبوری میں ڈائل کیا ہے کیونکہ تمہارا سیل نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ تمہارے علاوہ کوئی اور فون اٹھاتا تو میں بنا بات کیے بند کر دیتا۔ مجھے تمہارا نمبر چاہیے۔" ابھی اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"لیکن...!" خزران نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"پلیز رازی! اگر ابھی تم سے بات نہ ہوئی تو میری دماغ کی رگ بھی پھٹ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو میرا تم سے بات کرنا کتنا ضروری ہے۔ بحث میں مت پڑو۔ اپنا نمبر بتا کر روم میں جاؤ، تاکہ تسلی سے بات ہو سکے۔" وہ ہر گز مصالحت کے موڈ میں نہیں تھا۔ خزران نے اسے اپنا نمبر دے دیا۔

"ٹھیک ہے، میں پانچ منٹ تک کال کرتا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

خزران نے کمرا اندر سے بند کیا اور رائٹنگ ٹیبل کے پاس آبیٹھی۔ عازم کی ٹھیک پانچ منٹ بعد کال آگئی۔

"مبارک ہو...!"

"جی...؟" وہ ایسے آغاز پر حقیقتاً گڑبڑا گئی۔

"ارے بھئی۔ کالج کی پروفیسر بن گئی ہو۔ مبارک دے رہا ہوں۔"

"اوہ...!" وہ بری طرح جھینپ گئی۔ "تھینکس۔"

"جاب کب لگی... اور گریجویشن کے بعد مزید پڑھائی کا موقع کب ملا...؟"

"تقریباً" سال ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد ایم اے اکنامکس اور پھر ایم ایڈ بھی کر لیا تھا۔"

"چلو اچھا ہے" اتنی کم عمر میں یہ واقعی بہت بڑی کامیابی ہے۔"

"اب ایسی بھی کم عمر نہیں۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"ہاں ویسے عقل کے حوالے سے تو بچوں کو بھی

مات دیے بیٹھی ہو۔" عازم کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔ خزران جواباً بول نہیں پائی۔ دل بری طرح سکڑا تھا۔ یقیناً اب وہ اصل موضوع پر آگیا تھا۔

"کیا واقعی یاسر نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ ایسے کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟" وہ حیران ہو گئی ایسے بے تکے سوال پر۔۔۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ یاسر اور اس کی طلاق ہو چکی ہے۔ بھلا شک کی کیا گنجائش۔

"میں نے سوچا شاید تم تردید کرو گی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ میں کیوں تردید کروں گی۔" وہ خاک نہیں سمجھ پائی۔

"بھئی تم طلاق کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہو' مجھے لگا شاید لوگ جھوٹے ہیں ورنہ علیحدگی کے بعد وہاں رہنے کا کیا جواز۔۔۔؟"

"بہت ساری وجوہات ہیں۔" اس نے خود کو کھل کر بات کرنے کے لیے تیار کیا۔

"جیسے۔۔۔؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یاسر یہاں نہیں رہتا۔ وہ اپنی سیکنڈ وائف کے ساتھ بحرین میں ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یاسر نے جو زیادتی میرے اور بچوں کے ساتھ کی' اس کی سزا بلاوجہ اماں کو کیوں ملے۔ میرے بچے دادی کے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں۔ یہاں سب ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں کیسے بچوں کو ان سے دور کروں۔"

"بس یہی دو وجوہات ہیں۔۔۔؟" عازم نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ اسے مسلسل الجھا رہا تھا۔

"اگر صرف یہی وجہ ہے تو میں کل ہی جنید سے بات کرتا ہوں کہ وہ آکر تمہیں لے جائے۔ حیرت ہے کیسا بھائی ہے۔ بہن طلاق کے بعد بھی سسرال میں پڑی ہے اور اسے کوئی پرواہی نہیں۔ اسے تو چاہیے تھا اگلے دن بازو سے پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لے آتا۔"

"اب اس میں جنید بھائی کا کیا قصور۔ میں اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی ہوں۔"

"تمہاری تو عقل گھاس چرنے گئی ہے۔" وہ اس پر بری طرح برسا۔ "کس دنیا میں رہتی ہو جاہل! تمہاری ساس اپنے بیٹے اور نئی بہو سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے لیکن تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ سے انہیں بلا نہیں پا رہی۔"

"ایسا کہا اماں نے؟" خزران نے حیرت سے دہرایا۔ "انہوں نے کہا تھا یاسر نے میرے اور بچوں کے ساتھ جو کیا' وہ ساری عمر اس کی صورت بھی نہیں دیکھیں گی۔ آصف بھائی بھی ہرگز اسے معاف کرنے

کو تیار نہیں۔"

"شاید تب تک وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نئی بہو کراچی کے بہت بڑے جیولر کی بیٹی ہے۔"

"یہ بات یہاں سب کو پتا ہے کہ اس لڑکی کا باپ سونے کا تاجر ہے۔" خزران نے عازم کے اندازے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا اور تمہیں لگتا ہے یہاں یہ بات سن کر کسی کی رال نہیں ٹپکی ہوگی۔ یہ لوگ اس امیر کبیر دلہن کا استقبال کرنے کے لیے بے چین ہیں اور تم۔" وہ پھر غصہ کھا گیا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" خزران نے لہجہ سخت کیا۔ "سب تمہارے مفروضے ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں اپنی پوری تنخواہ اماں جی کے ہاتھ پر رکھتی ہوں۔ وہ جیسے چاہے استعمال کرتی ہیں۔ پھر کیوں وہ ہمارے یہاں سے جانے پر خوش ہوں گی۔"

"مائی گاڈ....!" وہ چلایا۔ "تمہاری آمدنی پر پلنے کے بعد بھی ان کا رویہ تمہارے ساتھ شکر گزاروں والا ہونے کے بجائے احسان جتانے والوں جیسا ہے۔ ایک نظر اپنے بچوں کو دیکھو۔ گلی میں پھرتے بچے بھی ان سے اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑو، خود کو دیکھو۔ گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں بھی شرما جائیں۔ ڈوب مرو کہ تم ایک کالج کی پروفیسر ہو.... پکوڑے بیچ کر ڈگری حاصل کی ہے کیا؟" وہ اچانک اتنے غصے میں آیا کہ ایک لحظے کو خزران سہم سی گئی۔

"کل ہی اپنا سامان باندھو اور جنید کی طرف چلو۔ اس کی تو میں ٹھیک خبر لیتا ہوں۔" وہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر غصے میں تھا۔

"پلیز عازم! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔" خزران کے ہاتھ پیر ہی پھول گئے اس کا رویہ دیکھ کر۔ "دیکھو! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ جنید بھائی تو بہت بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ میں ان کے ہاں آجاؤں لیکن...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ "تم [redacted] بھابھی کی طبیعت تو جانتے ہو.... پھر جب سے میری طلاق ہوئی ہے ان کا رویہ اور بھی بدل گیا ہے۔ ہر لحہ انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں دو بچوں سمیت ان کے سر پر نہ جا بیٹھوں، جنہیں اکیلے رہنے کی عادت ہو جائے انہیں کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی۔ میں صرف ملنے بھی چلی جاؤں تو وہ نہایت روکھے انداز میں ملتی ہیں۔"

"ہوں.... تو یہ کہو ناں کہ یہ تیسری وجہ ہی اصل بنیاد ہے۔ چلو مان لیا لیکن جب تم پوری تنخواہ دے کر سسرال بلکہ سابقہ سسرال میں رہ رہی ہو تو تمہارا رویہ اتنا غلامانہ کیوں ہے۔ کیوں تم اور تمہارے بچے تن کر مالکوں کے اسٹائل میں نہیں رہتے؟"

"یہ تو بری بات ہے۔" اس نے فوراً بات کاٹی۔ "پیسہ دے کر احسان جتاتی اچھی لگوں گی کیا....؟"

"ہاں جانتا ہوں.... ایٹی کیٹس میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے میڈم نے.... لیکن جو لوگ تمہاری کمائی کھا رہے ہیں کم از کم انہیں تو اتنا پتا ہو کہ جس کا کھاتے ہیں اس کے گن بھی گاتے ہیں۔"

"ان کا رویہ بھی میرے ساتھ ٹھیک ہے۔ خوامخواہ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔" خزران باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی کمزوری پر قابو نہ پا سکی۔

"دنیا تم پر باتیں بنا رہی ہے بے وقوف لڑکی.... جب سے آیا ہوں۔ خاندان بھر میں یہی سرگوشیاں گردش کر رہی ہیں کہ خزران علیحدگی کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہے۔ [redacted] بھابھی کا رویہ تمہیں نظر آتا ہے اور جیٹھانی لبنیٰ کی پریشانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ جب یاسر سے تمہارا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو آصف بھی اب تمہارا جیٹھ نہیں ہے۔ نہ تم اس کی بھابھی ہو۔ گھر میں جوان، خوب صورت عورت کے رہتے، لبنیٰ کو سوتے جاگتے ہول اٹھتے ہیں۔" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

"فضول باتیں مت کرو عازم! آصف بھائی سے میرا جو احترام اور عقیدت کا رشتہ ہے کم از کم اس پر تو انگلی مت اٹھاؤ۔" وہ بری طرح بگڑ گئی۔

"انگلی نہیں اٹھا رہا.... میں نے تو لبنیٰ بھابھی کے

رویے سے، جو محسوس کیا وہی بتا رہا ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایسے بے ہودہ وہم میں کبھی نہیں پڑیں گی۔"

"او کے، لیواٹ۔۔۔ تمہاری لبنیٰ بھابھی کو تو میں زیادہ نہیں جانتا۔۔۔ ہم سمیعہ بھابھی کی بات کرتے ہیں۔ اب وہ تو میرے ماموں زاد کی بیوی ہے۔ اس کو تو میں قریب سے، جانتا اور سمجھتا ہوں۔ یہاں تم اپنی سابقہ سسرال پر ہر مہینے بلاوجہ پوری تنخواہ لٹا رہی ہو۔ اگر اس کا آدھا سمیعہ کے ہاتھ پر رکھ دو تو نہ صرف عزت سے سگے بھائی کے گھر رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا بلکہ یہی بھابھی تمہارے پیر دھو دھو کر بھی پیے گی۔ پھر نہ دنیا کی باتیں ہوں گی اور نہ ایسی غلامانہ زندگی جو میں آج دیکھ کر آیا ہوں۔"

اس نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں مفت مشورہ دیا اور خزران کچھ بولنے کی کوشش میں منہ کھولے بیٹھی رہ گئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنی ٹھوس، جامع اور پتے کی بات اس کے دماغ میں کیوں نہ آئی۔

"تم میری باتوں پر غور کرو۔ جنید سے فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرتا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اب نکلو اس دکھ سے کہ یاسر نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی اور تمہیں چھوڑ دیا۔ اب کوئی نیا غم پالو۔۔۔ اپنی اولاد کی فکر کرو' اس وقت ان کا واحد سہارا صرف اور صرف تم ہو۔ راتوں کو تکیے بھگونا اور دنیا والوں کی ہمدردیاں بٹورنا بند کرو۔۔۔ دم ہے تو ان دو معصوموں کے لیے کچھ کر کے دکھاؤ۔ جنہیں بلاوجہ رشتوں کی چکی میں پیس کے رکھ دیا ہے۔ نکالو انہیں دادا' دادی اور چچا چچی کے چکر سے۔۔۔ انہیں صرف تمہارا وقت' تمہاری قربت اور تمہارا ساتھ چاہیے۔ کیوں انہیں زبردستی پرانے رشتوں سے چپکا کر بیٹھی ہو۔۔۔ تمہاری ساس صاحبہ نے آج کی ایک گھنٹے کی ملاقات میں کوئی تین مرتبہ آہ بھر کر یاسر کو یاد کیا اور کہا کہ اس کی وجہ سے چپ ہوں۔۔۔ ہر کسی کو اپنی اولاد سے مطلب ہوتا ہے۔"

وہ اجازت لیتے لیتے بھی پوری تقریر کر گیا۔ خزران نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔

"یہ تو میں ہمیشہ سے جانتی ہوں عازم! کہ تم میرے سچے خیر خواہ ہو لیکن آج بھی اتنا ہی درد محسوس کرتے ہو۔" وہ خاموشی سے آکر بچوں کے ساتھ لیٹ گئی۔

چھت کو گھورتے' الجھی الجھی سوچوں سے نتیجے اخذ کرتے جانے کب وہ آٹھ سال پیچھے چلی گئی۔ یاسر سے شادی طے پانے سے محض دو مہینے پہلے تک بھی اس کی اور عازم کی دنیا کسی انقلاب اور طوفان سے قطعاً" ناواقف اور انجان تھی۔



"کیا کر رہی ہو پاگل۔۔۔ یہ ایکسیلیٹر ہے۔" عازم اپنے غصے پر حسب عادت قابو نہ پا سکا۔

"جاؤ میں نہیں سیکھتی ڈرائیونگ۔" وہ زور سے کندھا جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ عازم کو ہنسی آگئی۔

"یار! تین مرتبہ بتا چکا ہوں لیکن تمہیں بریک اور ایکسیلیٹر کا فرق ہی سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تو ٹیچر کی طرح سمجھاؤ ناں۔۔۔ مالکوں جیسا رعب کیوں ڈال رہے ہو۔" خزران نے منہ پھلایا۔

"ہم کہاں کے مالک ملکہ عالیہ! گاڑی بھی آپ کی ہے اور بندہ بھی آپ کا غلام ہے۔" وہ رومانٹک ہونے لگا تو خزران نے مسکراہٹ دبائی۔

"اچھا بس بس۔۔۔ جب تمہارے گھر آجاؤں تب کہنا۔ فی الحال ابو کو منانے کا کچھ سوچو۔"

"ارے یار! یہ ابو کہاں سے آگئے بیچ میں۔ کیوں لانگ ڈرائیو کا ناس مار رہی ہو۔" عازم سچ مچ بدمزا ہو گیا۔ خزران زور سے ہنس پڑی۔

عازم نے اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ خزران نے مزید ڈرائیونگ پریکٹس کا ارادہ ترک کر دیا اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی۔

"کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے سر پر لٹکی تلوار ہٹ نہیں جائے گی۔ یہ دو "ابے" ہمیں سچ مچ ہی نہ لے ڈوبیں۔ ابھی بھی وقت ہے نہ جاؤ ملائشیا اور ان دو ابو جان کے آپس کے اختلافات پر دھیان دو۔"

"اور کتنا سر پٹخوں رازی جان ....! روز ایک نئے آئیڈیے اور نئے حل کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچتا ہوں لیکن لمبی لمبی بے مقصد بحثوں کے بعد بھی ان چار دکانوں کا مسئلہ کالا باغ ڈیم کی طرح بجائے حل ہونے کے وہیں ٹھپ ہو جاتا ہے۔"

"پھر ہو گا کیا عازم ....؟" خزران کی تشویش کچھ اچانک ہی بڑھی تھی۔

"پوچھوں گا ان نند بھابی سے جنہوں نے دو معصوم بچوں کو نا سمجھی کی عمر میں ایک دوسرے سے منسوب کر دیا۔"

"یعنی ہمارا رشتہ ہونا اصل غلطی ہے۔" خزران اس کے جملوں پر جز بز ہونے لگی۔ "ویسے اتنے نا سمجھ بھی نہیں تھے ہم۔ میں پندرہ سال کی تھی اور جناب شاید سترہ اٹھارہ سال کے۔" اس نے یاد دلایا۔

"چلو مان لیا لیکن جب ہماری ماؤں کے شوہروں کی آپس میں نہیں بنتی تھی تو کیا ضرورت تھی ایسا نازک پنگا لینے کی .... لے کہ ہماری زندگی مصیبت میں ڈال دی۔"

"تمہیں میں مصیبت نظر آتی ہوں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "پھر کیوں جگہ جگہ ساتھ لیے پھرتے ہو۔"

"محبت کا روگ جو بھی پالتا ہے نری مصیبت ہی تو مول لیتا ہے۔" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ خزران کا چہرا ایک دم گلابی ہو گیا۔

"صرف بولنا آتا ہے۔ کرتے تو کچھ ہو نہیں۔" اس نے منہ بنا کر شکوہ کیا تو عازم کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

"اب اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔ تمہارے دماغ کا بھی بس اللہ حافظ ہے۔" خزران کو اس کی بے وقت کی ہنسی بالکل اچھی نہیں لگی۔

"بولنے سے پہلے سوچا تو کرو.... خیر یہ بتاؤ۔ میرے ملائیشیا جانے سے کیوں ناخوش ہو؟" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

"کیونکہ تم جھوٹے اور وعدہ خلاف ہو.... میں تو تمہیں خدا حافظ کہنے بھی نہیں آؤں گی۔" وہ پرانی بات یاد آنے پر پھر سے غصہ کھا گئی۔

"ارے اتنا غصہ.... یار! تمہاری قسم، ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ جانے سے پہلے ہماری شادی کا کچھ سلسلہ ہو جاتا یا کم از کم نکاح ہی ہو جاتا، تاکہ وہاں جا کر میں تمہیں بلوانے کے لیے کچھ کرتا۔ تمہیں بلوانے کے لیے نکاح نامے کی کاپی بہت ضروری ہے۔ لیکن دیکھ لو یہ نئے حالات.... خالد نے مجھے واقعی یہی کہا تھا کہ دو ماہ بعد آنا ہے لیکن اب اچانک، یہ کہہ کر فوراً" بلا لیا کہ وہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے اور نیا بندہ ارجنٹ چاہیے۔ اگر میں نہ گیا تو وہ کسی اور کو لگا لیں گے۔ یار! ایک سال کی تو بات ہے۔ تم لوگ شادی کی تیاریاں شروع کرو۔ سال گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"باتوں کے شہنشاہ ہو تم.... خود تو ابھی یہیں بیٹھے ہو اور ہمارا ولیمہ بھی کروا دیا۔" وہ بالکل اس کی باتوں میں نہیں آ رہی تھی۔ عازم نے مسکراتے ہوئے گاڑی روک دی۔

"تمہارا باپ ویسے بھی میری شکل سے نالاں ہے۔ اب اگر بنا نوکری کے نٹھلوں کی طرح جا کر شادی کی بات کروں گا تو جوتے مار کے بھگائے گا۔"

"شرم نہیں آتی۔ کیسی رف لینگویج بول رہے ہو۔ میرا باپ تمہارا سگا ماموں ہے۔" وہ برا مان گئی۔

"ہونے والا سسر بھی تو ہے۔" وہ زور سے ہنسا تو خزران مسکرانے لگی۔ "بدتمیز کہیں کے...."

"کہیں کے نہیں.... ہفتے بعد تو ملائیشیا کے کہنا۔"

"بہت خوش ہو ناں؟" خزران پھر سے اداس ہو گئی، تو عازم نے ایک آہ بھری۔

"نہیں رازی.... قسم سے دل بہت بھاری ہے۔ لیکن مرد ہوں ناں۔ اپنے جذبات چھپانے پڑتے ہیں۔"

"دل کیوں بھاری ہے....؟" خزران نے بے ساختہ سوال کیا۔

"اب یہ بھی پوچھو گی.... وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"ہاں ناں.... مجھے کیا پتا۔"

"تم لڑکیاں بھی ناں.... ذرا بھروسا نہیں کرتیں۔

اب سوچ رہی ہو گی ضرور اس کی وجہ "میں" تو نہیں ہو سکتی۔ ماں کی وجہ سے اداس ہو گا۔ دوستوں کی وجہ سے یا پھر گھر چھوڑنے کے خیال سے... ہوں؟" اس نے تائید طلب نظروں سے دیکھا تو خزران نے شرمندگی سے نچلا لب دبایا۔

"تم کبھی کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہو... ہر وقت تو غصے میں رہتے ہو۔"

"غصہ کرنے والوں کا دل نہیں ہوتا کیا...؟" اس نے سادگی سے خزران کا ہاتھ تھاما تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ آج تو بڑا مہربان رویہ تھا۔ یہ دعوا تو وہ حلفیہ کر سکتی تھی کہ عازم صرف اور صرف اسی کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ طبیعت کا ایسا لاابالی اور لاپروا تھا کہ ہمیشہ بس مستی کے موڈ میں رہتا تھا جبکہ وہ خود پھول کی پتیوں سے نازک جذبات والی رومانٹک اور جذباتی لڑکی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں امی اور پھپھو نے اسے عازم کے نام سے منسوب کر دیا تو بس ہمیشہ کے لیے دل کی لوح پر کندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ابو اور پھوپھا کے اختلافات کا اونٹ برسوں گزرنے پر بھی کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔

خزران کے والد توفیق حسین نے پراپرٹی خریدنے کا ارادہ کیا تو کسی نے مین روڈ کی چار دکانیں دکھائیں، جو انہیں بہت پسند آئیں۔ سوچا دکانیں کرایہ پر اٹھادیں تو ہر مہینے معقول کرایہ بھی ملنے لگے گا۔ لیکن دکانوں کی قیمت ان کی بساط سے قدرے زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنے بہنوئی جاوید علی یعنی عازم کے والد سے بات کی تو چار میں سے وہ ایک دکان خریدنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں چاروں دکانوں کی رقم یکمشت ادا کر کے معاملہ حل کر لیا گیا۔ جاوید علی ان دنوں پارٹ ٹائم چھوٹا موٹا بزنس کرنے کا ایسے بھی سوچ رہے تھے۔ دکان کا مالک بننے کے بعد ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ عازم ابھی میٹرک میں تھا لیکن عرفان نے گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ انہوں نے عرفان کی مدد سے آٹو اسپیئر پارٹس کی دکان کھول لی۔ کام چل نکلا اور آہستہ آہستہ پوری طرح قدم جم گئے۔ البتہ توفیق حسین نے اپنی تین دکانیں کرایہ پر لگا دی تھیں۔ لیکن چند ماہ بعد جیسے ہی ریٹائرمنٹ ملی اور بہت سارا پیسہ اکٹھا ہاتھ آیا تو ملنے جلنے والوں نے مشورہ دیا کہ دکانوں کی جگہ ڈبل اسٹوری مارکیٹ تعمیر کرالیں۔ بات ان کے دل کو لگی اور انہوں نے نیچے سپر مارکیٹ اور اوپر گارمنٹس شاپ بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس سارے منصوبے میں بڑی رکاوٹ جاوید علی کی دکان تھی۔ توفیق حسین کو اب وہ چوتھی دکان ہر قیمت پر چاہیے تھی کیونکہ اسے واپس لیے بنا مارکیٹ تعمیر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جاوید علی سے کہا کہ وہ اپنی دکان انہیں بیچ کر اپنا کاروبار کہیں اور شروع کر دیں۔ لیکن جاوید صاحب اس بات پر اڑ گئے کہ ان کا کاروبار لوکیشن کی وجہ سے کامیاب جا رہا ہے۔ اگر جگہ تبدیل کر دی تو کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی وہ اپنی دکان کے قانونی مالک ہیں۔ بنا اپنی مرضی کے وہ کیوں دکان سے دستبردار ہوں... عازم اور عرفان کئی طرح کے آئیڈیاز لے کر ماموں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بھی جنید پھوپھا کو قائل کرنے کے لیے ان کے پاس آبیٹھتا لیکن ڈھاک کے وہی تین پات کے مصداق معاملہ تھا کہ سلجھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وقت کافی آگے سرک گیا۔ خزران اس وقت بیسویں سال میں تھی اور گریجویشن کر رہی تھی۔ عازم ایم بی اے فائنل کرنے کے بعد فارغ تھا۔

اس کے دوست خالد نے ملائیشیا میں اس کی جاب کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اور پھر پتا بھی نہیں چلا اور دنوں میں اس کا کام ہو گیا۔

عازم ملائشیا چلا گیا تو خزران کے دو ہی شوق رہ گئے۔ دن میں اسے لمبی لمبی ای میلز لکھتی اور رات کو چیٹنگ کرتی۔ ان ہی دنوں یاسر کی والدہ اپنی بہو لینی کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ خزران انہیں جانتی تھی نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اسی لیے بالکل بھی ان کی آمد پہ دھیان نہیں دیا لیکن پھر تھوڑے دنوں کے وقفے سے وہ لوگ دوسری اور پھر تیسری مرتبہ آئے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ امی سے پوچھا تو وہ چھپا گئیں اور خزران ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ ابو نے یاسر سے اس کی بات پکی کر دی

تھی۔
اسے اور تو کچھ نہیں سوجھا فوراً "فضہ بھابھی کو فون کر دیا۔ وہ بھی سن کر کافی پریشان ہوئیں۔ شام کو سنجیدہ پھپھو، سکینہ پھپھو اور فضہ بھابھی ابو سے بات کرنے کے لیے ان کے گھر آ گئیں۔ لیکن ان کا آنا تھا کہ گھر میں طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس کے ابو نے سنجیدہ پھپھو کو خوب سنائیں کہ انہوں نے اپنے شوہر کو دکان واپس دلوانے کے لیے ایک بار بھی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ سکینہ پھپھو پر بھی سخت ناراض ہوئے کہ وہ بجائے بھائی کا ساتھ دینے کے بہن کی حمایت میں بولنے آ گئیں۔ اور یہ اعلان بھی صاف الفاظ میں کر دیا کہ خزران اور عازم کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ اسی مہینے کے آخر میں خزران کی شادی کرنے والے ہیں۔ سنجیدہ نہایت مایوس دل لیے بھائی کے گھر سے واپس لوٹ گئیں۔ ان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ عازم کا سامنا تھا۔ اس کے بے شمار سوالات کا جواب دینا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس سے تو یہ بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ ملائشیا سے ہی واپس آ جاتا۔ لیکن جب تقدیر اپنی من مانی کرنے پر آتی ہے تو ساری راہیں کوشش کے باوجود مسدود ہو جایا کرتی ہیں۔

عازم کی ابھی نئی جاب تھی۔ چھٹی بھی نہیں مل رہی تھی اور پاسپورٹ بھی کمپنی کے پاس تھا۔ ایک مخصوص مدت پوری ہونے تک اسے جاب چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے کسی انتہائی ایمرجنسی کے اس کا واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ قسمت نے کچھ ایسے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے کہ ساری بھاگ دوڑ رائیگاں گئی اور عازم روتی گڑگڑاتی خزران کے آنسو تک نہیں پونچھ پایا۔

اور وہ معاشرے کی اپنے جیسی بے شمار دوسری لڑکیوں کی طرح فرماں برداری پر مجبور کر دی گئی۔ عازم کی محبت کو باپ کی دہلیز پر دوسری تمام سہانی یادوں سمیت دفن کر کے یاسر حسنین کے گھر آ گئی۔ شروع کے دنوں میں وہ بہت خوفزدہ اور ڈری ڈری رہی کہ کسی بھی وقت اس سے عازم اور اس کے رشتے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ لیکن صرف ایک بار اس کی ساس نے ذکر چھیڑا۔

"سنا ہے، تمہاری پھپھو سنجیدہ اس لیے شادی میں نہیں آئیں کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی تم سے کرنا چاہتی تھیں؟"

"جی... ان کی یہ خواہش ضرور تھی لیکن ہمارے گھر میں کوئی ایسا نہیں چاہتا تھا۔"

خزران نے سوچا سمجھا جواب دیا تو انہوں نے بھی لاپروائی سے سر ہلا دیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی اور یاسر تو گھونگھٹ اٹھاتے ہی خزران کی موہنی صورت کا ایسا دیوانہ ہوا کہ دن رات، صبح شام سوائے خزران کے گرد پروانے کی طرح گھومنے کے اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اور وہ بھی رفتہ رفتہ یاسر کی محبتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔

یاسر بحرین میں کام کرتا تھا اور شادی کے لیے دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ یاسر کا ارادہ تو یہی تھا کہ بحرین واپس جاتے ہی خزران کو اپنے پاس بلا لے لیکن اماں نے خزران کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے منع کر دیا۔ وہ امید سے تھی اور چونکہ پہلا بچہ تھا اس لیے اماں کو وہم لاحق ہو رہے تھے کہ وہ اکیلی کیسے رہ پائے گی۔ یوں فوری طور پر اس کا جانا کینسل ہو گیا۔

اور نو مہینے بعد جب رافع اس کی گود میں آیا۔ عین ان ہی دنوں میں عازم کا ملائشیا میں ایک سال پورا ہوا اور وہ پہلی چھٹی پر پاکستان آیا۔ گھر والے تو اسے پہچان ہی نہیں پائے۔ سنجیدہ اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ ایسے لٹے پٹے، شکست خوردہ، خاموش عازم کو انہوں نے کب یہاں سے رخصت کیا تھا۔

پہلا شک انہیں یہ لاحق ہوا کہ عازم کہیں نشے کی لت میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ لیکن اپنی عمدہ تربیت کے مان نے انہیں ایسا سوچنے سے باز رکھا۔ وہ جان گئیں کہ عازم کی یہ حالت خزران کی شادی کے باعث ہوئی ہے۔

انہوں نے فضہ کے ساتھ مل کر اگلے ہی دن سے

لڑکی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ عازم چونکہ دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اس لیے وہ پُر یقین تھیں کہ کہیں نہ کہیں سلسلہ ضرور جم جائے گا۔ یوں قرعہ فال سارہ کے نام نکلا۔ سارہ کا تعلق غیر خاندان سے تھا۔ جلد شادی کرنے پر ان کی طرف سے زیادہ حیل و حجت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور عازم کے ملائشیا جانے سے بیس دن پہلے سارہ بیاہ کر ان کے گھر آگئی۔ کزن کی حیثیت سے خزران نے بھی شادی میں شرکت کی۔

انسانی ذہن بھی اللہ تعالیٰ نے خوب بنایا ہے۔ انقلابی تبدیلیوں کی آمد سے پہلے تو انہیں سوچنا بھی نا ممکنات میں سے لگتا ہے۔ لیکن وہی انقلابی تبدیلیاں جب وقوع پذیر ہو جاتی ہیں تو بڑی سہولت سے ذہن نہ صرف انہیں قبول کر لیتا ہے بلکہ بعض حالات میں ہم یہ بھی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ "اب" جو ہوا' وہی ٹھیک ہے۔ خزران جو کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ شاید اب وہ زندگی بھر عازم کا سامنا نہیں کرپائے گی' بڑے ہی نارمل دل و دماغ سے ہر فنکشن میں شریک ہوئی۔ البتہ عازم کا شادی کے دوران جتنی مرتبہ بھی اس سے سامنا ہوا' وہ ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈال کر رخ بدل گیا۔

عازم نے ملائشیا واپس جاتے ہی سارہ کو اپنے پاس بلوانے کی کوششیں شروع کردی تھیں اور شادی کے تین ماہ بعد ہی وہ عازم کے پاس ملائشیا چلی گئی۔ ادھر ایک سال پورا ہونے پر یاسر بھی پاکستان آگیا۔ خزران اس کی آمد پر بے حد خوش تھی لیکن جانے کیسے وہ ایک مہینہ پر لگا کر اڑ گیا۔ یاسر بھی واپس جاتے ہوئے بہت اداس تھا۔ خصوصاً" رافع کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس نے خزران سے وعدہ کیا کہ جاتے ہی وہ انہیں بلوانے کی کوشش کرے گا۔ خزران حد سے زیادہ پر امید تھی کہ جلد ہی وہ اور رافع یاسر کے پاس ہوں گے۔ لیکن یاسر نے واپس جاتے ہی کمپنی کی صورت حال اور اپنی جاب کے حالات کے بارے میں بتایا کہ فی الحال معاملات زیادہ ٹھیک نہیں چل رہے'

کچھ دن بعد۔۔۔۔

پھر یہ "کچھ دن بعد" کا سلسلہ طویل ہوتے ہوتے مزید ایک سال لے گیا اور یاسر دوسری چھٹی پہ پاکستان آگیا۔ اور اس بار جب وہ گیا تو خزران ایک مرتبہ پھر امید سے تھی۔ یعنی اب تو کچھ کہنا ہی بے کار تھا۔ اور منال کی پیدائش کے بعد تو وہ مصروف اس قدر ہو گئی کہ سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ کچھ گزرے تین سالوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اماں اس کے پردیس جانے کے حق میں نہیں تھیں۔ کیونکہ اس کے بحرین جانے سے یاسر کے اخراجات ایک دم سے بڑھ جاتے اور گھر بھیجی جانے والی رقم پر برے اثرات مرتب ہوتے۔

خزران نے یہ سب دیکھ سمجھ کر خاموشی اختیار کرلی اور یاسر کو اپنے بلوانے کے متعلق کہنا چھوڑ دیا۔ اب اس نے کیلنڈر سے دوستی کرلی تھی۔ جہاں یاسر کے آنے جانے اور پھر انتظار کے بے شمار دنوں کا حساب درج تھا۔ بلکہ یاسر کے پاس بحرین نہ جانے کا ایک فائدہ یہ ہو گیا کہ اس نے آگے پڑھائی جاری رکھی۔ شادی کو چھ سال گزر گئے۔

رافع پانچ سال کا اور منال تین سال کی تھی' جب پہلی مرتبہ معمول کے مطابق چلتی لگی بندھی زندگی میں پریشانی کی ہوا چلی۔ آصف بھائی کے ایک دوست کی بیوی سعدیہ ان کے گھر آئی تو اس نے اماں کو بتایا کہ اس نے یاسر کے متعلق کچھ سنا ہے۔ سعدیہ کا بھائی بحرین میں رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یاسر وہاں کسی پاکستانی لڑکی میں انوالو ہے' بلکہ شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اماں کو یقین تو نہیں آیا لیکن سعدیہ کو بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی سوبر لڑکی تھی۔ بلاوجہ لگائی بجھائی کرنا اس کی فطرت نہیں تھی۔ اماں نے اسی شام خزران سے بات کی اور کہا کہ وہ صاف صاف یاسر سے اس بارے میں پوچھ کچھ کرے۔

خزران کی کیفیت بھی کچھ اماں جیسی ہی تھی۔ ایسے اچانک اتنی بڑی بات کا سامنے آنا کچھ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔ پھر ابھی دو ماہ پہلے ہی تو یاسر چھٹی گزار کر گیا تھا۔ اس کے رویے اور محبت میں اس نے کہیں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی تھی۔ پھر بھی اس نے یاسر سے

بات کرلی لیکن ظاہر ہے کہ وہ صاف ٹال گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ حتیٰ کہ مہینوں گزر گئے اور بات خزران کے دماغ سے بھی نکل گئی کہ اچانک ایک دن آصف بھائی کے نام یاسر کا خط آگیا۔ حالانکہ دونوں بھائی انٹرنیٹ اور فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے' پھر بھی یاسر نے خط کا سہارا لیا۔ شاید وہ شرمندگی سے بچنا چاہ رہا تھا۔

اس نے لکھا کہ وہ قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے ہے لیکن وہ اپنے والدین کے ساتھ بحرین میں رہتی ہے۔ عینی مجھ سے شادی کی شدید خواہش مند ہے اور وہ خزران اور بچوں کو قبول کرنے کو بھی تیار ہے' لیکن اس کے والد ہرگز ایک شادی شدہ مرد کو داماد بنانے کو راضی نہیں ہیں۔ بالآخر بہت مشکلوں سے انہوں نے اس شرط پر شادی کی اجازت دے دی کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں تب ہی عینی سے شادی کر سکتا ہوں۔۔۔ اور یاسر عینی کی محبت میں خزراں کو طلاق دینے کو تیار ہو گیا تھا۔

آصف بھائی کے ذمے اس نے یہ کام لگایا کہ وہ اماں کو بتا دے اور خزران کو سمجھائے۔ آصف کو خط پڑھ کر شدید غصہ آیا اور یاسر کو فون کر کے کسی بھی قسم کے تعاون سے قطعاً" انکار کر دیا۔ اماں بھی سن کر سخت ناراض ہوئیں، کہ خزران اور بچوں کو بے قصور اتنی بڑی سزا دینا سراسر زیادتی ہے۔ خزران کا تو یہ حال تھا کہ اسے یہ سب کچھ جھوٹ اور مذاق لگ رہا تھا۔ اس نے یاسر کو فون کیا کہ ابھی وہ ہنس کر کہہ دے گا کہ ڈیر یہ سب مذاق تھا۔ لیکن وہ تو آگے سے رونے لگا۔

"میں بہت مجبور ہو گیا ہوں خزران! تم تو جانتی ہو' میں تم سے اور بچوں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

"کک کیا بات ہے یاسر! کیسی مجبوری' پلیز کھل کر بتائیں۔" اس کے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے یاسر کو روتا دیکھ کر۔

"میں نے عینی کے باپ سے لاکھوں روپے کا قرض لیا تھا لیکن میرے حالات ابھی ایسے نہیں ہیں کہ رقم انہیں لوٹا سکوں۔۔۔ اور انہیں لگتا ہے کہ میں کسی بھی وقت جاب چھوڑ کر پاکستان بھاگ جاؤں گا اور واپس نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے اب ہر طرح سے پھانس رہے ہیں۔"

"آپ نے قرض کیوں لیا یاسر اور۔۔۔ اور آپ کو وہاں روکے رکھنے کا حل شادی ہی کیوں۔۔۔ آپ ہم سے کہیں ناں' ہم یہاں رقم کا کوئی بندوبست کرتے ہیں۔" وہ سادگی سے اس کی دلجوئی کرنے لگی۔

"کچھ نہیں ہو سکتا خزران۔۔۔! یہ لوگ بہت ہوشیار ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں۔۔۔ میں بہت بری طرح پھنس چکا ہوں۔۔۔" وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

"آپ واپس آجائیں یاسر۔۔۔ پلیز جاب چھوڑ کر جلد از جلد ہمارے پاس آجائیں۔" وہ رو رو کر اس کی منتیں کرنے لگی۔ لیکن ہوا نہ بس یہ کہ ایک ہفتے بعد یاسر کی طرف سے طلاق نامہ آگیا اور وہ ایسی بے وقوف تھی' شدید دکھ کی کیفیت میں بھی یہی سوچے جا رہی تھی کہ پتا نہیں یاسر وہاں کن مجبوریوں کا شکار ہو گیا ہے' لیکن یاسر کے فریب کا پردہ بھی جلد ہی چاک ہو گیا۔

وہ طلاق کا کوئی بیسواں روز تھا۔ آصف بھائی کی بڑی بیٹی لاریب لیپ ٹاپ لے کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"یہ دیکھیں خزران چچی۔۔۔ یاسر چاچو کی نئی دلہن۔" وہ تقریباً" دکھاتے ہوئے اس کے قریب آبیٹھی، اور لیپ ٹاپ اس کے سامنے کیا۔ خزران نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ دیکھیں! یاسر چاچو نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ہنی مون کی نئی پکچرز اپ لوڈ کی ہیں۔"

مصر کے حسین مضافات میں وہ اپنی نئی دلہن کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نہایت شاداں و فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اسے اپنے ہاتھوں سے آئس کریم کھلا رہا تھا تو کہیں وہ لڑکی اس کے بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

خوب صورت نقوش کی مالک وہ گوری سی لڑکی یاسر کو پاکر نہایت مسرور لگ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور ان تمام تصاویر میں کہیں بھی یاسر افسردہ اور مجبوریوں کا مارا نہیں لگ رہا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ خزران نے اپنی اور یاسر کی شادی کی تصاویر پرزے پرزے کرکے ڈسٹ بن کے حوالے کی ہیں۔ گزشتہ بیس راتوں سے جنہیں ہاتھ میں اٹھا کر وہ بین کیے جا رہی تھی۔ حالانکہ ان تصاویر کو سنبھال کر رکھنا ویسے بھی اب بے معنی تھا۔ وہ سے اپنی زندگی سے نکال چکا تھا۔ اب وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ دل نے تسلیم کرلیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہاں لیکن اب پچھلے پانچ چھ ماہ کے دوران نہیں کم ہوئی تھیں تو اس کی بے چینیاں اور شدید احساس محرومی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر سوچتی کہ کہاں کمی رہ گئی تھی، خوب صورتی، تعلیم، اچھی عادات، یاسر کے لیے محبت، اولاد، سب کچھ تو تھا پھر کیوں.....؟

لیکن عازم کے دو ہی جملوں نے ایسا زوردار اثر کیا کہ ذہن پر پڑی جمود کی گرد ہٹنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے کیسے پتا چل جاتا ہے ہر بات کا..... جب اس نے کہا کہ ”کلو اس احساس سے کہ یاسر نے تم سے بے وفائی کی ہے..... چھوڑ دو تکیے بھگونا اور لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنا تو خزران نے نہایت شرمندگی محسوس کی..... صحیح تو کہتا ہے، جو ہو چکا وہ بدل نہیں سکتا، پھر کیوں وہ سوچ سوچ کر بلاوجہ اپنا اور بچوں کا نقصان کر رہی ہے، جبکہ یاسر وہاں دونوں ہاتھوں سے زندگی کی خوشیاں سمیٹ رہا تھا۔

صبح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر جائے نماز پر گم صم بیٹھی رہی۔

”کتنی بڑی بے وقوف ہوں میں۔“ خود پر ہنستے ہوئے، جانے کہاں سے دو آنسو بہہ کر گال پہ اتر آئے۔ انہیں صاف کرتے کرتے وہ زار و قطار ہچکیوں سے رونے لگی۔ دیر تک رونے سے دل کا کتنا غبار ہلکا ہو گیا۔ وہ جائے نماز لپیٹ کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

جنید بھائی نے یوں تو ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھا تھا لیکن امی، ابو کے گزر جانے کے بعد تو انہوں نے خزراں کو اپنی ذمہ داری سمجھنا شروع کردیا تھا۔ ہمیشہ ہر خوشی، غم، عید، برات کے موقع پر جتنا ان سے بن پڑا، انہوں نے بہن کے لیے کیا۔ سمیعہ بھی شروع سے یہی دیکھتی آرہی تھیں کہ باوجود اپنے محدود وسائل کے جنید نے کبھی بہن کے معاملے میں کمی نہیں آنے دی۔

لیکن بہن..... اس نے کیا کیا تھا آج تک..... ہمیشہ سسرالیوں کو خوش کرنے کے جتن کرتی رہی..... لین دین کی لسٹ سے اس نے بھائی کو قطعی طور پر خارج سمجھا ہوا تھا۔ کبھی بھائی، بھابی یا بھتیجیوں کے لیے کوئی معمولی سا تحفہ بھی نہیں لیا تھا۔ عازم نے احساس دلایا تو خزراں خود کو کوس کوس کر تھکنے میں نہیں آرہی تھی۔ ناشتا بنانے اور کرنے کے دوران بھی وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی۔

”خزران پلیز! تم ذرا یہاں بیٹھ جاؤ۔ مجھے آصف کے سلائس پر مکھن لگانا ہے۔“ لبنیٰ بھابی نے آہستہ آواز میں کچھ جتانے کے سے انداز میں درخواست کی تو وہ چونکی۔ بے دھیانی میں جانے کب وہ آصف بھائی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اماں کے پاس جا بیٹھی۔

”مناہل کو ڈاکٹر کے پاس کب لے جانا ہے؟ میں ابھی آدھے گھنٹے تک ایک ضروری کام سے باہر جاؤں گا۔“ آصف نے براہ راست اسے مخاطب کیا، جواب ابھی اس کے منہ میں تھا کہ لبنیٰ بھابی بول پڑیں۔

”کوئی بات نہیں آصف! آپ جائیں..... خزران کے ساتھ میں چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی اتنی صبح ڈاکٹر کہاں آتے ہیں۔ کیوں خزران.....؟“

”جی بھابی.....!“ وہ مختصر جواب دے کر مناہل کو کھانا کھلانے لگی۔

”تو تم یہاں بھی درست تھے عازم! جانے میں کس دنیا میں رہتی ہوں۔ لبنیٰ بھابی کے ایسے جملوں سے تو میرا روز واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن اس نہج پر کبھی سوچا ہی نہیں۔ کیا لبنیٰ بھابی کے مستقل سردرد کی وجہ میں

ہوں…؟" انہیں یہ مسئلہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔ "تو کیا وا میری یہاں موجودگی سے پریشان ہیں؟"

خزراں چند اور سوالات کا بوجھ لیے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی۔

کمرے میں آکر اس نے سب سے پہلے اپنا پرس کھنگالا' لیکن وہاں سے برآمد ہوئے بس ڈھائی' تین ہزار… اماں کے ہاتھ پر پوری تنخواہ رکھنے کے بعد وہ صرف اپنی ضرورت کی رقم ہی پرس میں رکھا کرتی… اس نے تھوڑی دیر کچھ سوچا' پھر الماری سے چیک بک نکال کر پرس میں ڈالی۔ طلاق سے پہلے چونکہ یاسر اسے ہر مہینے الگ سے رقم بھیجا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی تنخواہ بینک سے نکلواتی ہی نہیں تھی۔ کم از کم پانچ' چھ ماہ کی تنخواہ اس کے پاس اب بھی محفوظ تھی۔

بچوں کو تیار کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے بھی ایک اچھا سوٹ نکالا۔ لبنیٰ بھابھی سے اس نے کہہ دیا' کہ وہ کچھ دیر کے لیے جنید بھائی کے گھر جائے گی۔ انہوں نے تو جان چھوٹ جانے پر ویسے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ خزران اماں کو بتانے ان کے کمرے میں چلی گئی۔

مناہل کو کچھ دن سے اسکن الرجی کا مسئلہ شروع ہوا تھا۔ پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھایا' پھر مارکیٹ سے جنید بھائی' **سمیعہ** بھابھی اور سندس' یسریٰ کے لیے شاپنگ کی۔ جوش محبت ایسا غالب تھا کہ اس نے پوری رقم اڑا دی۔

جنید بھائی کے گھر بنا اطلاع آکر انہیں حیران کرنے کی کوشش کی' لیکن وہاں عازم کو بیٹھے دیکھ کر خود حیران ہو گئی۔ وہ سب ہی اس وقت باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ خزران نے شاپنگ **بیگز** بھابھی کو تھمائے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ بچے البتہ سندس اور یسریٰ کو ڈھونڈتے اندر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ **سمیعہ** بھابھی سامان رکھنے اندر گئیں تو جنید بھائی بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ شاید اس کی خاطر مدارت کے سلسلے میں۔

"تم کب آئے؟" خزران نے تنک کر اسے گھورا تو وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے اسے دیکھنے لگا۔

"آج لگ رہی ہو پروفیسر صاحبہ… ویسے خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔" وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔ اکثر ہی آجاتی ہوں۔" وہ خوامخواہ صفائی دینے لگی۔

"ہاں ابھی یہی بتا رہا تھا جنید کہ میڈم کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔" اس نے نہایت شوخی بھرے لہجے میں اسے مزید چڑایا۔ پچھلی رات کی ڈانٹ پھٹکار اور غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"تم نے کوئی بات تو نہیں کی بھیا سے؟" وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"کون سی بات؟" وہ ہنسنے لگا۔

"وہی جو تم کہہ رہے تھے کہ میرے یہاں رہنے کی بات ان سے کرو گے۔" وہ دھیمی آواز میں سرگوشی کرنے لگی۔

"ارادہ تو تھا' لیکن اب لگتا ہے ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ ہنسا تو خزران بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

"تمہیں گھر میں آرام نہیں آتا… خاندان بھر کی دن گن لیتے پھر رہے ہو؟"

"غصہ کرتی ہو تو قسم سے' بہت اپنی لگتی ہو۔" وہ آنکھوں میں چمک لیے پھر تنگ کرنے لگا۔ خزران مزید غصہ کھا گئی۔

"اور جب تم ہنستے ہو نا تو زہر لگتے ہو۔" وہ پاؤں پٹختی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے عازم کا بھرپور قہقہہ بلند ہوا۔



وہ جب سے جنید بھائی کے گھر سے آئی تھی' عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ **سمیعہ** بھابھی تو چند ایک چھوٹے موٹے تحائف پا کر ہی اس قدر ممنون ہو گئی تھیں کہ ان کا لہجہ' برتاؤ' خاطر مدارت سب میں اس روز واضح تبدیلی آئی تھی۔ زبردستی اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ خزران ان سب کے لیے جو ڈریسز لے گئی تھی بھابھی ایک ایک چیز کی تعریف کیے جا رہی

تھیں۔

عازم سے گفتگو کے بعد ویسے تو مسلسل وہ اس نہج پر سوچ رہی تھی کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ بھابھی کی طرف سے اچھے رسپانس کے بعد تو وہ جلد از جلد اسے عملی جامہ پہنانے کا سوچنے لگی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اماں اور آصف بھائی سے کس طرح بات کرے۔ زندگی نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے سو مرتبہ سوچنا پڑتا تھا۔

کمرے میں یہاں سے وہاں چکر کاٹتے اس نے بے شمار جوڑ سوچ ڈالے۔ لیکن کسی بھی نتیجے پر پہنچنے میں سخت کنفیوژن محسوس کی۔ عازم سے بات کیے بنا چارہ نہیں تھا۔ لیکن وہ بے شرم... بولتا بہت ہے۔ خزران نے تین مرتبہ موبائل اٹھا کر واپس رکھ دیا۔ بچے سونے کے لیے آئے تو انہیں تھپکیاں دیتے بالآخر کال ملانے کا مضبوط ارادہ کر لیا۔

"اہے نصیب..." بنا سلام دعا عازم نے شوخی سے آغاز لیا۔

"سارہ کہاں ہے؟" وہ پریشان ہو گئی کہ عازم کے شوخ معنی خیز لہجے سے سارہ کچھ اخذ نہ کر لے۔

"ارے وہ تو اپنی سرزمین پر لینڈ کرتے ہی ہفتہ دس دن کے لیے میکے رخصت ہو جاتی ہے۔ آخر وہاں جاؤ بھی تو خوب کیے جاتے ہیں۔" وہ ہنسا تو خزران نے پہلا سکون کا سانس لیا۔

"پھپھو کے گھر سے کب آئے تم لوگ؟"

"ہاں... اماں کے گھر تو دو ہی دن رہے۔ پھر سارہ اپنی امی کے گھر چلی گئی اور میں یہاں کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہو گیا۔ ابھی پچھلے تین دنوں سے اپنے گھر میں ہوں۔" وہ اب سنجیدگی سے بات کرنے لگا تھا۔ خزران نے بھی سہولت محسوس کی۔

"عازم! مجھے تم سے مشورہ کرنا تھا۔"

"ہوں... ہوں... کہو۔"

"مجھے لگتا ہے تم صحیح کہہ رہے تھے۔ اب مجھے بھیا کے گھر آ جانا چاہیے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ان سب سے بات کا آغاز کیسے کروں۔"

"صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میرا یہاں رہنا اب مناسب نہیں۔" عازم قدرے حیران ہوا اس کی سوچ بچار پر۔

"ایسا تو میں شروع شروع میں کہہ چکی ہوں۔ یہ لوگ زبانی بہت ہمدردی جتاتے ہیں۔ بچوں سے ایسی شدت کی محبت ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ ان کے دلوں میں کچھ اور ہے اور لبوں پہ کچھ اور..."

عازم کو خوشی ہوئی جان کر کہ خزران حقیقت کا ادراک رکھتی ہے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا شاید ایسوں کے ہاتھ بے وقوف بن رہی ہے۔

"سب سمجھتی ہوں عازم! سات سال گزارے ہیں ان کے ساتھ۔ میں تو بس سمیعہ بھابھی کے رویے کی وجہ سے مجبور تھی۔ وہ گتھی تم نے اتنی آسانی سے سلجھا دی۔ اب تو ایک ایک لمحہ یہاں گراں گزر رہا ہے۔ ہاں البتہ علیحدگی کے فوراً" بعد ان سب نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ طلاق کے فوراً" بعد کا کچھ عرصہ میں نے انتہائی تکلیف اور اذیت میں گزارا۔ مجھے لگتا تھا میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گی یا مجھے برین ہیمبرج ہو جائے گا۔ یہ سوچ ہی بہت اذیت ناک تھی کہ یاسر سے ہمیشہ کے لیے ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کی بے وفائی اور بے حسی مجھے ایک ڈراؤنا خواب لگتی تھی۔ دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کا دل میری اور بچوں کی محبت سے خالی ہو چکا ہے۔ اماں اور آصف بھائی فون پر یاسر سے جھگڑا کرتے۔ صاف الفاظ میں اسے کہتے کہ اب وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ مجھے ہر طرح کی تسلی دی کہ کبھی مجھے بے سہارا نہیں چھوڑیں گے۔ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے میں ان کی ممنون ہوتی چلی گئی۔ تنخواہ اماں کے ہاتھ پہ رکھنے کا فیصلہ بھی اس لیے کیا کہ اب میں یہاں کی کسی چیز پر اپنا حق محسوس نہیں کرتی۔ لیکن مجھ سے ہمدردی کا یہ رویہ بس مہینہ ڈیڑھ کی بات ثابت ہوئی۔ یاسر سے

ان سب کی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہی بار بار فون کر کے جانے کیا کچھ کہتا رہتا تھا۔ شاید معافی مانگی ہو یا خود کو صحیح ثابت کرنے کے دلائل دیے ہوں۔ بہرحال جو بھی ہوا۔ پچھلے تین' چار ماہ سے میں تو یہی دیکھ رہی ہوں کہ نہ میرے بچوں کا ٹھیک سے خیال رکھا جاتا ہے' نہ ہی میری کسی بات کو اب یہاں کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ یاسر کے خلاف بولنا بھی سب بند کر چکے ہیں۔"

"پھر تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا' کیوں اتنے مہینوں سے ان سب کے برے رویے سہہ رہی تھیں۔" وہ ایک بار پھر حیران ہو گیا۔

"یہ سب اتنا آسان کہاں ہے۔" وہ خاصی بے چارگی سے بولی' جس پر عازم مزید تپ گیا۔

"اچھا اور جتنی آسانی سے تمہاری ہنستی بستی زندگی تباہ ہوئی' اس کے متعلق کیا کہو گی اسٹوپڈ لڑکی۔ ایسی بے چاروں اور مظلوموں والی باتیں کرتی مجھے سخت بری لگتی ہو۔ اتنی ہی بے بس اور لاچار ہو تو جلاؤ اپنی ڈگریاں اور لات مارو نوکری پر۔ تمہیں تو چاہیے تھا پہلی فرصت میں کہیں الگ کوئی گھر یا فلیٹ لے کر اپنے بچوں سمیت وہاں شفٹ ہو جاتیں۔ کیا تم الگ رہنا افورڈ نہیں کر سکتیں؟" وہ پھر اس کی کلاس لینے لگا۔

"بچوں کا کیا کرتی۔ مجھے تو کالج جانا ہوتا ہے۔ روز یہاں سے شیخوپورہ جاتی اور آتی ہوں۔ اتنا ٹائم ہو جاتا ہے۔" وہ منمنائی۔

"کیا میڈ کا کال پڑ گیا ہے شہر میں۔ گھر تو کر ہی سکتی ہو ذاتی گاڑی بھی رکھ سکتی ہو لیکن جاہلوں کی طرح ساری رقم ان ناقدروں کے ہاتھ پہ دھر کے ماسیوں جیسے حلیے میں ان کی نوکریاں دے رہی ہو اور یہ جو شیخوپورہ سے روزانہ لیٹ آنے کا رونا رو رہی ہو تو محترمہ! روزانہ لاہور والوں کو اپنا چہرہ کرانا بہت ضروری ہے کیا۔ یا بنا آپ کے آئے یہاں سورج غروب نہیں ہوتا۔ بھئی! وہاں ہاسٹل ہو گا' اسٹاف کے لیے کوارٹرز ہوں گے اور بھی ٹیچرز رہتی ہوں گی۔ بچوں کو اپنے ساتھ رکھو اور آرام سے سیٹ ہو جاؤ۔" وہ اسے مختلف حل بتاتے بتاتے پھر طیش میں آ گیا۔

"یقین نہیں آتا' تم وہی خزران ہو جو کالج کے اسٹیج پر دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے مائیک توڑ دیا کرتی تھی۔" وہ اسے لتاڑنے لگا اور خزران خاموشی سے اس کی پھٹکار سنے گئی۔

"جانتی ہو خزران! جب میں کبھی نیوز میں سنتا یا پیپر میں پڑھتا کہ ایک عورت نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی یا پیٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگا لی' زہر کھا لیا۔ تو دونوں طبیعت بوجھل رہتی۔ الفاظ سوتے جاگتے میرے کانوں میں گونجتے رہتے اور میں یہی سوچتا کہ کیوں اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی اپنے ہی ہاتھوں اتنی آسانی سے ختم کر لی۔ کیا اس کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا۔ کسی کے گھر کام کر لیتی' کہیں مزدوری کر لیتی۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر ہاتھ ہی پھیلا لیتی۔ چلو بہت غیرت مند تھی اور بھیک مانگنا گوارا نہیں تھا تو ایدھی ہوم سینٹر میں بچوں کو چھوڑ آتی۔ لیکن غیرت مند کہاں تھی۔ خود بھی حرام موت مر گئی اور بچوں کا قتل بھی سر پر لے لیا۔ کیوں کر لیتے ہیں لوگ ایسے بے رحم فیصلے۔ پر اب تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں' شاید وہ عورتیں ٹھیک تھیں۔ ان پڑھ' غربت میں پلی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ جب تم جیسی اعلا تعلیم یافتہ' برسر روزگار عورت کا یہ حال ہے تو جو جی میں آئے جو کی بیٹیو! کرو۔ سب جائز ہے۔" وہ بولنے پہ آیا تو بے تکان بولے چلا گیا۔ خزران لب چبائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن بہت مشکل تھا۔ بے لگام آنسوؤں کی لکیر گردن تک بہہ آئی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"تم اس وقت کہاں تھے عازم! جب مجھ پر اتنی بڑی قیامت گزری' میں بہت اکیلی ہو گئی تھی۔"

وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ عازم نے کرب سے ہونٹ کاٹے۔ خزران کا رونا اس کا دل چیر رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری تکلیف نیزے کی طرح دل کے آرپار ہوئی تھی۔ لیکن خاموش رہا۔ خزران کا درد بانٹنے

کو تو وہ اب بھی جی جان سے حاضر تھا' لیکن زبانی ایک جملہ بھی ادا کرنا سراسر اس سے دشمنی کرنے کے مترادف تھا' کیونکہ یہی ہمدردی کے بول سن سن کر تو گزشتہ پانچ چھ ماہ سے وہ مظلومیت کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اگر وہ بھی یہی سب کچھ کرنے لگتا تو کون سمجھاتا اسے کہ نہ وہ مظلوم ہے نہ کمزور۔

"خود کو سنبھالو خزران۔۔۔ اور سنو! یہاں سے جانے کا ایک سیدھا ساحل ہے میرے پاس۔۔۔ سن رہی ہو نا؟"

"ہوں۔۔۔" خزران نے دھیان اس کی طرف لگایا۔

"پہلے جنید سے بات کرو' اسے کہو کہ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ پھر اسے سمجھاؤ کہ وہ تمہاری ساس کے پاس آئے اور انہیں کہے کہ لوگ خزران کے یہاں رہنے پر بہت باتیں بنانے لگے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب وہ مزید یہاں رہے۔ لہٰذا وہ تمہیں لینے آئے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ یہی صحیح ہے۔۔۔ میں پہلے بھیا سے بات کرتی ہوں۔" اس نے ایک دم اپنے اندر سکون اترتا محسوس کیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سو طرح کے جملے اور مکالمے رٹنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اماں سے اس طرح بات شروع کروں گی' پہلے یہ کہوں گی' پھر وہ کہوں گی۔۔۔ عازم نے جو حل بتایا اس کے مطابق تو اماں سے براہ راست بات کرنے کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ جانے اس کا اپنا دماغ کیوں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

"دو باتیں میری یاد رکھنا۔۔۔ پہلی یہ کہ جب تک اس گھر میں ہو' یاسر کی یادوں سے جڑی رہو گی جو کہ اب سراسر نقصان کا سودا ہے۔ جوں ہی جگہ تبدیل ہو گی' نہ صرف دماغ کھلے گا' بلکہ پوزیٹو خیالات آنا شروع ہوں گے۔ مثبت سوچوں کو اپنے اندر جنم دو۔۔۔ ابھی جینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے شاید تم سے زیادہ دنیا دیکھ لی ہے۔ یہاں زخموں پہ مرہم بھی پیسوں سے رکھا جاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ' میل جول' رسموں رواجوں اور رشتے ناتوں کے سب کھیل آج صرف پیسے سے چلتے ہیں اور تم نے بہت حد تک اس سے نہ صرف نبھا کر لیا ہے' بلکہ بہت سہولت سے اسے اپنی زندگیوں میں شامل کر لیا ہے۔ تمہارے لیے شاید یہ نئی بات ہو' لیکن اسی سے تمہاری اور تمہارے بچوں کی خوشیاں جڑی ہیں۔ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرنے کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔ تمہارا اچھا برا سوائے تمہارے کوئی نہیں سوچ سکتا اور امید۔۔۔ صرف اللہ سے۔ رکھو۔ سن رہی ہو نا۔" عازم کو اس کی طویل خاموشی پر تشویش ہوئی۔

"ہاں۔۔۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔ "تمہارے آخری جملے سے پہلے تم سے امید لگائے بیٹھی تھی۔ تم نے پل میں وہ مان چھین لیا۔"

"اوہ۔۔۔" عازم شرمندگی سے ہنس پڑا۔ "میں تو بھئی فلسفہ جھاڑ رہا تھا۔ بولو کیا کام ہے؟"

"چھوڑو' پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے فون رکھ دیا۔

"ارے۔۔۔ سنو تو۔۔۔" بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ پھر اس نے بھی موبائل ایک طرف پہ رکھ دیا۔



عازم نے واقعی سچ کہا تھا۔ بھیا کے گھر آ کر ذہن ایک دم دوسرے کئی معاملات کی طرف ایسے منتقل ہوا کہ دنوں اس کے پاس کچھ سوچنے کا جیسے وقت ہی نہیں رہا۔

جنید بھائی نے اس کے کہنے کے مطابق یاسر کے گھر والوں سے بات کی اور اگلے ہی دن اسے اپنے گھر لے آئے۔ وہ آخری رات خزران نے اپنے کمرے میں بہت تکلیف میں کاٹی۔ کمرے کی ایک ایک چیز یاسر کی یادوں سے جڑی تھی۔ وہ کمرا جہاں وہ بیاہ کر آئی تھی۔ سوچا نہیں تھا' ایک دن وہاں سے ایسے حالات میں جانا پڑے گا۔ یاسر کی اس کے لیے محبت' بچوں سے والہانہ لگاؤ' دونوں کی آپس کی انڈر اسٹینڈنگ کبھی کسی بات نے ایک لمحے کے لیے بھی اس وہم میں نہیں ڈالا کہ یاسر بدل سکتا ہے۔ وہ بھی شادی کے محض سات سال بعد۔۔۔ پتا نہیں لوگ کیوں کہتے ہیں کہ اولاد میاں' بیوی کے رشتے کو مزید مضبوط کرتی ہے۔ یاسر

نے تو بچوں کا بھی نہیں سوچا۔ وہ اگلے ہی روز بمع سازو سامان بھیا کے گھر آگئی۔ وہ سامان جو بھیا اور ابو نے اس کی شادی کے موقع پر بڑے پیار سے بنوایا تھا۔ خزران نے چند دن کے اندر سب بیچ کر رقم بھیا کے حوالے کردی۔ جنید بھائی کے گھر جیسے اس نے نئی زندگی کی شروعات کیں۔ سمیعہ بھابھی کے ہاتھ پر اس نے یہ کہہ کر تنخواہ رکھی کہ۔۔۔

"بھابھی! یہ پیسے آپ کہیں سنبھال کر رکھ لیں۔ میرے پاس کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔" اور ہفتے بھر بعد اس میں سے آدھی رقم لیتے ہوئے نہایت سلجھے طریقے سے کہہ دیا۔

"باقی رقم آپ استعمال کرلیں بھابھی! اب میں اور بچے آگئے ہیں تو ظاہر ہے اخراجات بڑھ جائیں گے۔"

"لیکن یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔" سمیعہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"کوئی بات نہیں بھابھی! پیسہ تو کام ہی آتا ہے۔ جو رقم گھر کے خرچ سے بچ جایا کرے، آپ خود رکھ لیا کریں۔ میں نے اپنے استعمال کی رقم لے لی ہے۔"

اس نے نرمی سے بھابھی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تو سمیعہ مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔

بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ صبح کالج جانے کے لیے تیار ہو کر نکلتی تو ناشتا تیار رہتا۔ کالج سے واپس آتی تو بچے نہا دھو کر کھانا بھی کھا چکے ہوتے اور اکثر جنید بھائی کی بیٹیوں کے ساتھ آرام سے بیٹھے کارٹون دیکھ رہے ہوتے۔ وہ سخت شرمندہ ہو کر شام کے کام بھابھی سے لینے کی کوشش کرتی، لیکن وہ اسے منع کردیتیں۔

"یہ سب میرے روٹین کے کام ہیں خزران! تمہارے آنے سے کوئی ایکسٹرا بوجھ نہیں پڑا۔"

"لیکن بھابھی! سارا دن کام میں جتے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔۔۔ مجھے نہیں لگتا آپ کو ریسٹ ملتا ہے پھر میں بھی آپ کی ہیلپ نہیں کرپاتی۔ آپ کہیں تو ہم کوئی کام والی رکھ لیں۔" خزران نے چند دن میں ہی نوٹ کرلیا کہ بھابھی بہت کام کرتی تھیں۔

"کام والی۔۔۔" سمیعہ نے حیرت سے زیر لب دہرایا۔

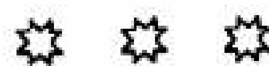
"ٹھیک ہے۔ کوکنگ وغیرہ تو میں خود ہی کروں گی۔ بس یہ جھاڑو، پوچا کوئی اور لے لے تو سچ میں بہت آرام مل جائے گا۔"

سمیعہ نے بھروسے مند کام والی کا بندوبست خود ہی تین روز کے اندر کرلیا۔ خزران نے اس طرف سے سکون کا سانس لیا۔ یہ سب کرنے کے پیچھے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شروع دن سے بھابھی کے ساتھ جیسے اچھے حالات آرہے ہیں۔ وہ فضا قائم رہے اور چھوٹے موٹے مسائل اس تعلق پر اثرانداز نہ ہوں۔ شام کے وقت بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس نے خود اٹھالی۔ رافع اور مناہل کے ساتھ ساتھ وہ یسری اور سندس کو بھی پڑھانے لگی۔ اس سے بھی سمیعہ کو کافی آرام مل جاتا۔ جنید بھائی بھی اس کے آجانے سے بہت خوش تھے۔ ایک دن شام کی چائے پیتے ہوئے اسے کہنے لگے۔

"تمہارے آنے سے گھر کا وہی پرانا ماحول تازہ ہوگیا۔ امی ابا کی یاد آجاتی ہے۔"

ابا کا انتقال خزران کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد اچانک دل کی تکلیف کے باعث ہوا تھا اور امی ان کے گزرنے کے بعد ایک سال ہی زندہ رہیں۔ قسمت کے فیصلوں کو واقعی کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اگر ابا ایک، ڈیڑھ سال اور اس کی شادی کی جلدی نہ کرتے تو آج وہ عازم کی بیوی ہوتی، لیکن زندگی ہمارے نپے تلے اصولوں کے مطابق کہاں چلتی ہے۔

ابا کی وفات کے بعد دکانوں کو مارکیٹ بنانے کا منصوبہ خود ہی دھرا رہ گیا تھا۔ جنید نوکری والا بندہ تھا۔ نہ اس کے پاس مارکیٹ بنانے کے لیے وقت تھا اور نہ پھوپھا، پھپھو سے تعلقات بگاڑنے کا کوئی ارادہ۔۔۔ عرفان اور عازم کے ساتھ بحیثیت کزن نہایت اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ انہیں بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے دکانیں کرایہ پر ہی رہنے دیں اور پھوپھا اپنی دکان پر اپنا کاروبار چلاتے رہے۔



کالج کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ گھر واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ شہر پہنچی تو تین بج چکے تھے۔ اس نے پہلے بینک جانے کا ارادہ کیا۔ سمیعہ بھابھی کو فون کر کے اس نے بتا دیا کہ ذرا لیٹ گھر پہنچے گی۔ بینک پہنچ کر ابھی وہ پارکنگ کے لیے جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ اے ٹی ایم مشین کے سامنے کچھ ہنگامہ نظر آیا۔ خزران نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے سمجھنے کی کوشش کی۔ تب ہی نظر عازم پر پڑی۔ دو پولیس والے اسے کھینچتے ہوئے پولیس وین کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ لنگڑا کر چلتے ہوئے تقریباً" کھنچا جا رہا تھا۔ لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ ان کے پیچھے تھی۔ خزران بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل کر ان کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا عازم! کیا بات ہے آفیسر۔" وہ بالکل وین کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ عازم نے اسے دیکھ کر سکون کا گہرا سانس لیا اور نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

"کون ہیں آپ؟" پولیس والے نے اسے بری طرح نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔

"میں کالج کی پروفیسر ہوں۔ یہ میرے کزن ہیں اور ایک شریف شہری ہیں۔ آپ انہیں اس طرح کیوں لے جا رہے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟" خزران نے قدرے رعب سے تعارف کرایا۔

"یہ شریف آدمی اے ٹی ایم سے رقم چرا کر بھاگ رہا تھا۔" پولیس والے نے اپنا کیس مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خزران بری طرح بگڑی۔ "بولو عازم! کیا معاملہ ہے۔" وہ نیچے کو جھکی لیکن عازم چپ رہا۔ گھٹنے کی چوٹ شاید اسے کافی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ دو، تین لوگ مجمع میں سے آگے نکلے۔

"باجی! یہ آدمی بے قصور ہے۔ لیکن یہ پولیس والے ہماری بات ہی نہیں سن رہے۔ ادھر آؤ بابا جی۔" انہوں نے ایک بزرگ کو پیچھے سے نکالا۔ "یہ آدمی مشین سے پیسے نکال رہا تھا۔ تب ہی دو لڑکے اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی سے رقم چھیننے لگے۔ ان صاحب نے دیکھا تو فوراً" اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی کو ڈاکوؤں سے چھڑانے لگے۔ تب ہی یہ دو پولیس والے آگئے اور انہوں نے سمجھا کہ رقم چھیننے والے لوگ تین ہیں۔ وہ، دو اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔" اس لڑکے نے ہمت کر کے تفصیل بتائی تو پولیس والے شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگے۔

"چھوڑیں اسے۔۔۔" خزران نے غصے سے پولیس والے کو دیکھا اور سہارے سے عازم کو اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک، دو اور بھی مدد کو آپہنچے اور عازم کو خزران کی گاڑی تک پہنچایا۔

"بنا تصدیق مارنا بھی شروع کر دیا۔ کم از کم لوگوں کی سن تو لیا کریں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عازم کو لڑکوں نے فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ خزران نے گاڑی دوبارہ روڈ پر ڈالی۔

"کیا ضرورت تھی دوسروں کے معاملے میں پڑنے کی؟ اگر خدانخواستہ ان کے پاس پسٹل ہوتا تو۔۔۔"

"پسٹل تو دونوں کے پاس تھے۔ لیکن چلانے میں اناڑی تھے۔" وہ ہنسا۔

"تو کیا انہوں نے فائر بھی کھولا تھا؟" خزران کا دل لمحے کو ڈوب سا گیا۔

"ہاں۔۔۔ ایک لڑکے نے گولی چلائی تھی۔ دروازے کا شیشہ ٹوٹ گیا۔"

"تم بھی نا عازم!" وہ جھلا گئی۔ "پلیز یہاں احتیاط سے رہا کرو۔ یہاں تو ہر قدم پر ایسے خطرات کا سامنا ہے۔"

"ہاں، پر مجھے تو تمہارے پولیس والے لے ڈوبے۔۔۔ سنا تھا یہاں پولیس بھی موقع پر نہیں پہنچتی۔ لیکن داد دینی پڑے گی کیا کمال ایفی شینسی ہے۔"

"کہاں کی ایفی شینسی۔۔۔ مجرم تو بھاگ گئے اور لے کے تمہاری ٹانگ۔۔۔" جملہ خزران کے منہ میں رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ عازم کی ٹانگ پر توجہ کی۔ گھٹنا اس بری طرح چھل گیا تھا کہ پینٹ پر خون نظر آنے لگا تھا۔ "اوہ تمہاری ٹانگ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ عازم! یہ زخمی کیسے ہوئی۔"

"ہائے مت، پوچھو۔۔۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "ظالموں نے تابڑ توڑ ڈنڈے برسائے اور گھٹنا۔۔۔ اس لیے چھل گیا' کیونکہ گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ پتا نہیں راستے میں کیا کچھ آیا' نہیں پروا کب تھی۔"

"پہلے تمہیں اسپتال لے جاتی ہوں۔"

"نہیں بھئی۔۔۔ اب کہیں اور خوار ہونے کی سکت نہیں ہے۔ تم مجھے گھر تک چھوڑ دو' میرے پاس فرسٹ ایڈ کا سب سامان موجود ہے۔"

"لیکن عازم! چوٹ گہری نہ ہو۔" وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔

"اب کوئی چوٹ گہری نہیں لگتی۔" وہ ہنس پڑا۔

"تم یہاں آئے کیسے تھے۔ آئی مین گاڑی یا بائیک وغیرہ تھی تمہارے پاس؟" خزران نے بات بدلی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے عرفان بھائی نے یہاں ڈراپ کیا تھا۔ وہ آگے کسی کام سے چلے گئے۔ واپسی پر ٹیکسی کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چونکا۔ "تم کس کی گاڑی لیے ہوئے ہو۔ ڈرائیونگ بھی خود۔۔۔ حیرت ہے، میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔" وہ ایک دم حیران نظر آنے لگا۔ خزران ہنس پڑی۔

"اپنی گاڑی ہے۔"

"اپنی۔۔۔ مطلب، جنید کی؟ لیکن اس کے پاس تو بائیک ہے۔" وہ خود ہی سوال جواب کرنے لگا۔

"نہیں بھئی۔۔۔ میری اپنی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"کب لی؟"

"جنید بھائی کے گھر آتے ہی خرید لی تھی۔ بینک کے توسط سے لی ہے۔"

"واہ بھئی۔۔۔ یہ تو سچ مچ بڑا کمال کام کیا۔ اتنی جلدی میری بات پر عمل کرو گی۔ بالکل اندازہ نہیں تھا۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

"اس روز تم سے گاڑی کے متعلق ہی کچھ مشورہ مانگنے لگی تھی جب تم نے دوسروں سے امید لگانے سے منع کر دیا تھا۔"

"اوہ!" عازم نے یاد آنے پر افسوس اچکائی۔ "یار! اب مشورہ مانگنے سے تو منع نہیں کیا تھا۔ تم بھی بہت ڈیپ لے لیتی ہو باتوں کو۔"

"مجھے صرف مشورہ نہیں' بلکہ تمہاری مدد بھی چاہیے تھی۔ گاڑیوں کے ماڈل' قیمتوں اور کارکردگی وغیرہ کے متعلق میری معلومات صفر ہیں۔ پھر بینک کا جھنجھٹ بھی لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ سوچا تم ان معاملات میں بہت ہوشیار ہو۔ سارا کام تمہارے ہی ذمے لگا دوں گی۔" اس بار خزران نے تفصیلی جواب دیا۔

"تو پھر۔ بنا میری مدد کے کیسے، کر لیا۔" اس نے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

"بھیا نے اپنے کسی دوست سے، بات کی' اس نے سارا کام کروایا۔"

"چلو' شکر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب تم بہت خود مختار اور پُر اعتماد نظر آنے لگی ہو۔ ایسی رہا کرو۔ تم میں دم ہے کچھ بھی کر لینے کا۔" وہ کھل کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ خزران چپ ہی رہی۔

"یہ ڈرائیونگ میں اتنی مہارت کہاں سے حاصل کی۔ مجھ سے تو روز ڈانٹ کھاتی تھیں۔" عازم کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگا۔

"لائسنس ہولڈر ہوں۔ مہارت، کیسے نہیں آئے گی۔" اس نے ابرو چڑھائے۔

"لو۔۔۔ لائسنس ہولڈر تو یہاں ہر دوسرا بندہ ہے' بنا کسی ٹریننگ کے' پاکستان میں یہ کون سا بڑا کمال ہے۔"

"آج کل بڑی یہاں' وہاں کرنے لگے ہو۔ چند سال باہر کیا گزار لیے تم میں تو پاکستانیت ہی نظر نہیں آتی۔" وہ خفا سی ہو گئی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ باہر والوں میں پاکستانیت تم لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بس یہاں کے سسٹم دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ شکوہ سسٹم سے ہے' پاکستان سے نہیں۔"

"بھیا بتا رہے تھے' تم ہمیشہ کے لیے آ گئے ہو' خیریت؟" خزران نے موڑ کاٹا۔

"ہاں... کچھ ضروری کام نپٹانے ہیں۔" وہ سیٹ سے پشت ٹکاتے ہوئے عجیب افسردہ سے لہجے میں بولا۔ خزران اس کے انداز پر چونکی' لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ عازم کا گھر آگیا تھا۔ وہ باہر نکل کر تیزی سے دوسری طرف پہنچی۔ عازم اپنی طرف کا دروازہ پہلے ہی کھول چکا تھا اور نیچے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسے خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ خزران نے خود ہی اس کا بازو تھام لیا۔ اس کے سہارے وہ قدرے سہولت سے باہر آگیا۔ اس نے بغلی جیب سے چابیاں نکال کر خزران کی طرف بڑھائیں۔ "ذرا لاک کھول دو۔"

"سارہ نہیں ہے گھر پہ؟" خزران چابیاں لیتے ہوئے تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ آج صبح ہی اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ تم بس مجھے دروازے تک چھوڑ دو۔ ویسے بھی تم بینک کے کام سے لیٹ ہو رہی ہو۔" وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے گیٹ کھول کر اسے اندر آنے میں مدد دی۔

"بینک کا کام تو اب کل ہی ہو سکے گا۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گی۔ آؤ... تمہیں کسی آرام دہ جگہ بٹھا دوں۔" وہ اسے سہارا دیے کوریڈور سے گزر کر لاؤنج میں آئی۔

"بس یہیں صوفے پر بیٹھوں گا۔"

"بیڈ پر لیٹ جاؤ معلوم نہیں زخم کتنا شدید ہے۔"

"نہیں... فی الحال ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ گھٹنے کی کچھ ٹریٹ منٹ کرتے ہیں۔ بعد میں ضرورت محسوس ہوئی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔" وہ آگے بڑھ کر خود ہی صوفے میں دھنس گیا اور ٹانگ سامنے ٹیبل پر لمبی کی۔

"وہاں ٹی وی کے ساتھ الماری کے نچلے خانے میں دیکھو فرسٹ ایڈ باکس ملے گا۔" وہ کہنے لگا۔ خزران نے باکس لا کر سامنے ٹیبل پر رکھا۔

"اب ذرا فریج سے کچھ برف نکال دو۔" وہ آگے بڑھ کر باکس کھولنے لگا۔ خزران کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فریج سے کیوبز نکال کر واش بیسن کے پاس رکھیں۔ پھر ریک سے ایک بڑا پیالہ نکالا اور اب یہاں سے وہاں جانے اور کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ کچن کی بڑی سی کھڑکی لاؤنج میں کھل رہی تھی۔ عازم نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی اور مسکرا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"حق تو صرف تمہارا تھا یہاں کی ہر چیز پر... لیکن یہ تقدیر کا پنجہ بہت ظالم ہے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ خزران کچھ ہی دیر میں برف کے ٹکڑے پیالے میں لیے واپس آگئی۔

"ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو؟" وہ ماتھے پہ بل ڈال کر اسے دیکھنے لگی۔ عازم کو خزران کی ڈانٹ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

"پینٹ گھٹنے سے چپک گئی ہے عازم... اب کیا جادو سے اس پر دوا لگے گی۔"

"بعد میں کرلوں گا۔ تم جاؤ... یہ پینٹ پائنچوں سے تنگ لگ رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ گھٹنے تک اونچی ہوگی۔" عازم اس کی بات سمجھ کر وضاحت دینے لگا۔

"تمہاری پینٹ کا کپڑا نرم اور لچک دار ہے اگر جینز ہوتی تو واقعی بہت مشکل ہو جاتی۔ تم آہستہ آہستہ گھٹنے تک اٹھاؤ۔ پائنچہ بھی زیادہ تنگ نہیں ہے۔" وہ بالکل اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ عازم نے آرام آرام سے پائنچہ اوپر اٹھایا۔

"اف...!" خزران دل پہ ہاتھ رکھے وہیں نیچے بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی عازم کا صرف گھٹنا چھلا ہے' لیکن اس کی تو پوری ٹانگ ہرٹ ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سرخ دھبے نظر آرہے تھے جو یقیناً "پولیس کے ڈنڈوں کا نتیجہ تھے۔ گھٹنے کا حال سب سے برا تھا۔ اوپر جلد اس بری طرح اتری تھی کہ اب سرخ اور سفید حصہ نکل آیا تھا۔

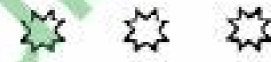
"گھٹنے پہ برف مت لگانا۔ جلن بھی ہوگی اور پانی لگانا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ میں کریم لگاتی ہوں۔ تم بعد میں ان باقی سرخ دھبوں پر لگاتے رہنا۔" خزران نے کریم اپنی انگلیوں پہ نکال کر لیپ لگانا شروع کیا۔

نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ درد برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خزراں نے پوری ٹیوب اس کے زخم پر خالی کر دی۔ عازم نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ وہ کریم لگانے کے ساتھ ساتھ زخموں پر پھونکیں بھی مار رہی تھی۔ اس کی پانیوں سے جھلملاتی آنکھیں دیکھ کر عازم حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم رو رہی ہو؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ خزراں نے چونک کر اوپر دیکھا تو بے شمار آنسو چھلک کر گال پہ اترے۔ وہ گھبرا کر چہرہ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے لیے درد محسوس مت کیا کرو۔" وہ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"پھر تم بھی چھوڑ دو ایسا کرنا۔" وہ آہستہ سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ عازم اس کی پشت دیکھتے ہوئے گم صم بیٹھا رہا۔



"آپ بھی ناں آپی.... آپ کو لگتا ہے میرے مسائل کا حل نفسیاتی معالج کے پاس ہے۔" سارہ کلینک کی سیڑھیاں اتر کر پارکنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ سیما آپی پھولی سانسوں کے ساتھ اس کے مقابل آئیں۔

"مجھے تو تمہاری صحت کی فکر ہے۔ ٹینشن لے لے کے تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے.... پانچ سال بڑی ہوں تم سے اور لوگ تمہیں میری بڑی بہن سمجھتے ہیں۔ یہی حال رہا تو عازم تمہاری طرف دیکھنا بھی چھوڑ دے گا۔" سیما نے پارکنگ کا رخ کیا تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"اچھا اور آپ کی سائیکاٹرسٹ نے کون سا تیر مار لیا۔" سارہ نے طنزیہ ان کو دیکھا۔ "سکون آور گولیاں .... اور بس یعنی یہی حل ہے میرے مسئلے کا....!"

"ارے بھئی! گولیاں لو گی تو نیند اچھی آئے گی' پرسکون نیند سے صحت بھی بہتر ہو گی اور بلاوجہ ہر وقت سوچتے رہنے سے بھی نجات ملے گی۔ یہ ڈاکٹر بہت لائق ہے۔ اس نے تمہارا مسئلہ جان کر دوائیں تجویز کی ہیں۔ اب تم یقیناً" بہت ذہنی سکون محسوس کرو گی۔"

ملائشیا سے آنے کے بعد سارہ نے کافی وقت سیما کے ساتھ گزارا تھا۔ سیما نے محسوس کیا کہ وہ اولاد کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہو چکی ہے۔ اس کا دن رات ایک ہی معاملے کو لے کر پریشان رہنا' سیما سے دیکھا نہیں گیا۔ تب ہی سائیکاٹرسٹ وقت لے کر اسے دکھانے لے آئی۔

"میرا ذہنی سکون تو...." گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ رک گئی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک اسکول بس آ کر رکی تھی۔ دو نرسری کی بچیاں بیگ سنبھالتی نیچے اتر کر اسی کی طرف چل کر آنے لگیں۔ آگے والی چھوٹی بچی دو چٹیاں باندھے اپنے ماتھے کے بالوں کو پیچھے کرتی بیگ سنبھالتی آگے بڑھنے لگی۔ چہرے پر آئے پسینے کو اس نے اپنی ننھی انگلیوں سے صاف کرنے کی کوشش کی تو میلے ہاتھوں کے دھبے اس کے سفید چہرے پر نظر آنے لگے۔ سارہ نے بے ساختہ اپنے دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لیا۔ بچی کافی قریب آ چکی تھی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ بچی کو روک کر اس کا چہرہ اپنے پلو سے صاف کرے اور اس کے سفید گال چوم لے۔ لیکن وہ مستی میں مگن قریب سے گزر کر چلی گئی' اور سارہ مٹھی بھینچ کر اپنے درد کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس پلو کے نصیب میں کہاں' کسی بچے کا ناک منہ صاف کرنا...." وہ دوپٹا چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سیما نے اسے گھر کے دروازے پر چھوڑا۔ سارہ نے اندر بلایا لیکن اس کے بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ اس لیے باہر سے ہی گاڑی بڑھا لے گئی۔ سارہ اندر آئی تو عازم اپنی زخمی ٹانگ ٹیبل پہ رکھے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

"ارے.... کیا ہوا آپ کو؟" ٹانگ کے سرخ دھبے اور گھٹنے پر کریم کا لیپ دیکھ کر وہ پریشانی سے آگے بڑھی۔

"پولیس والوں کی مہمانی کا شکار ہوا ہوں۔" عازم ہنسا۔

"پولیس... کہاں گئے تھے آپ؟" وہ مزید حیران ہو گئی۔ عازم نے تفصیل بتانا شروع کی۔ وہ سننے کے ساتھ ساتھ ٹیبل کا سامان سمیٹنے لگی۔

"خزران وہاں کیسے آئی...؟"

"وہ چھوڑو اور یہ سوچو اگر خزران وہاں نہ آتی تو اس وقت میں لاک اپ میں ہوتا۔"

"یہاں بہت احتیاط سے رہا کریں عازم! ادھر حالات مختلف ہیں۔" سارہ نے خزران والے انداز میں تنبیہہ کی تو عازم نے مسکرا کر سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

"آپ کو کچھ چاہیے...؟" ٹیبل صاف کر کے وہ سیدھی ہوئی۔

"گرم دودھ کا ایک گلاس دے دو... تھوڑی سی ہلدی بھی ڈال دینا۔"

"ہوں..." وہ کچن کی طرف چل پڑی۔ عازم دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پچھلے کچھ سالوں سے ازدواجی زندگی کچھ ایسے ہی روٹین کے جملوں کے گرد گھومنے لگی تھی۔ نہایت رسمی اور بہت حد تک روکھی پھیکی سی... عازم نے بہت مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ عازم نے بارہا اسے کہا کہ وہ خود کو مصروف رکھا کرے۔ لیکن وہ اس قدر حساس ہو چکی تھی کہ کسی وقتی مصروفیت سے بہل جانا اس کے بس میں نہیں تھا... ہر وقت ایک ہی سوچ، ایک ہی خیال... حالانکہ اسے تو ساس کے روایتی طعن و تشنیع کا سامنا بھی نہیں تھا، سنجیدہ تو بلکہ نرمی اور پیار سے اسے سمجھاتیں لیکن اس پر کوئی تسلی اثر نہیں کرتی تھی۔ پاکستان آکر البتہ اتنی بہتری ضرور آئی تھی کہ دن کا وقت وہ اپنے بہن بھائیوں کے ہاں گزار آتی تھی۔

اب پچھلے کچھ دنوں سے مصروفیت قدرے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ عازم کی خالہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ دونوں کافی سالوں کے بعد کسی خاندانی فنکشن میں شریک ہو رہے تھے، اس لیے سارہ زور و شور سے تیاریوں میں مصروف تھی۔ عازم خوش تھا کہ سارہ کی ذہنی رو نے رخ تبدیل کیا تھا۔ البتہ یہ بھی جانتا تھا کہ شادی ختم ہوتے ہی وہ پھر سے افسردہ اور بیمار نظر آنے لگے گی۔



"سکینہ پھپھو کا تین مرتبہ فون آچکا ہے اور آج تو تم معمول سے بھی لیٹ آئی ہو۔" خزران گھر میں داخل ہوئی تو سمیعہ بھابھی اور بچے تیار بیٹھے تھے۔

"ہاں بھابھی! جانتی ہوں، بس چھٹی ہوتے ہی پرنسپل صاحبہ نے چھوٹی سی میٹنگ بلوالی۔ اچھا میں تیار ہو کر بس ابھی آئی۔" وہ فوراً ہی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آج سویرا کی مہندی تھی۔

مہندی کا فنکشن کافی اچھا رہا تھا۔ وہ لوگ رات کو ایک بجے کے قریب گھر پہنچے... خزران خوش تھی کہ اگلے روز اتوار ہے، کم از کم بچوں کی تھکاوٹ تو اتر جائے گی۔

سکینہ پھپھو بیوہ تھیں اور یہ ان کے گھر کا پہلا فنکشن تھا۔ اس لیے عین بارات کے وقت پہنچنا ان سب کے لیے مناسب نہیں تھا۔ خزران نے گلی میں ہی گاڑی پارک کی۔ سامنے عرفان بھائی کی کار کھڑی تھی۔ یعنی وہ بھی آچکے تھے۔ آج سویرا نے تیار ہونے پارلر جانا تھا۔ چار بجے کے قریب وہ سمیعہ بھابھی اور سویرا کو پارلر چھوڑ آئی۔ ان کو وہاں سے واپس لانے کی ذمہ داری بھی خزران کی تھی۔ گھر واپس آتے ہی اس نے بچوں کی تیاری شروع کروا دی۔ سمیعہ بھابھی، یسریٰ اور سندس کو تیار کرنے کا کام بھی اسے دے گئی تھیں۔

اپنے لیے اس نے سبز اور سرمئی امتزاج کا ہلکے کام والا سوٹ نکال کر پہنا۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی چٹیا بنا کر بائیں کندھے پر آگے ڈالی۔ اور کانوں میں چھوٹے بندے پہن کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

"بس... یہی...؟" اچانک پیچھے فضہ بھابھی کی آواز آئی تو وہ چونک کر پلٹی۔

"جی...؟"

"میک اپ، کیوں نہیں کیا خزران.... کل بھی میں نے دیکھا تم نے، لباس بھی نہایت سادہ پہن رکھا تھا اور دھلے منہ کے ساتھ پورا فنکشن اٹینڈ کیا۔ ایسا کیوں کر رہی ہو۔" انہوں نے خزران کو سامنے کھڑا کر کے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جواباً "بالکل چپ رہی۔

"یاسر نے تمہیں طلاق دی ہے خزران! تم اس کی بیوہ نہیں ہو جو ایسا سوگ والا انداز اپنا رکھا ہے۔ خود کو آزاد سمجھنا کب شروع کرو گی۔ تم اس طرح سادگی سے رہتی ہو تو لوگ کہتے ہیں۔ اسے یاسر سے طلاق کا ابھی تک غم ہے۔ میری مانو اور خوب بن ٹھن کے رہا کرو۔ زیادہ سے زیادہ، سب یہی کہیں گے کہ دیکھو اسے تو طلاق کی کوئی پروا ہی نہیں.... ہاں بھئی ٹھیک ہے.... جیسا سلوک یاسر نے تمہارے ساتھ روا رکھا' پروا ہونی بھی نہیں چاہیے۔"

"اب مجھے واقعی پروا نہیں ہے بھابھی.... میں تو۔"

"جانتی ہوں...." فضہ نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن اس لاپروائی کو ظاہر تو کرو۔ اس نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے تو تم بھی بتا دو دنیا کو کہ ٹھوکر مارنے والے کو تم بھی جوتی کی نوک پر رکھتی ہو۔ چلو میں خود تمہیں تیار کرتی ہوں۔"

وہ زبردستی اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بٹھا کر تیار کرنے لگیں۔ ان کے اپنائیت بھرے انداز پر خزران مسکرا کر سامنے بیٹھ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، لیکن پلیز لائٹ میک اپ کیجیے گا۔"

"ہاں.... ہاں ٹھیک ہے۔ اب چپ بیٹھو۔" وہ اسے لائنر لگانے لگیں۔ سمیعہ بھابی کا پارلر سے فون آیا کہ سویرا تیار ہو چکی ہے۔ خزران خود بھی تیار ہو چکی تھی۔ فضہ بھابھی کو بتا کر اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اکیلی ہی باہر آ گئی۔

گاڑی اسٹارٹ کر کے جونہی گلی سے نکال کر سیدھی کی۔ اچانک ساتھ والا دروازہ کھلا اور عازم اندر آ بیٹھا۔

"تم....؟" وہ یک دم بوکھلا گئی۔

"پلیز، مجھے ذرا آگے تک ڈراپ کر دو.... سارہ کسی پارلر میں کھڑی میرا ویٹ کر رہی ہے۔" وہ عجلت میں بولنے لگا۔ خزران نے منہ پھلا کر بنا کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"بنا سوچے کہیں بھی کود پڑتے ہو۔ پھپھو کے دروازے پر کتنے لوگوں نے تمہیں دیکھا ہو گا۔ پتا نہیں اب کیا کیا باتیں بنائیں گے۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

"ارے ایک' دو محلے کے لوگ کھڑے تھے۔ اب انہیں کیا پتا ہمارے معاملے کا۔"

"نہ تمہیں لوگوں کی پروا ہے' نہ میری عزت کی' لیکن میں بہت ڈرتی ہوں عازم....!"

"ڈر کی وجہ؟" عازم نے اس کے پچھلے جملے کو نظر انداز کیا حالانکہ غصہ بہت آیا تھا۔

"طلاق یافتہ عورت کی زندگی ایک جوان کنواری لڑکی کی زندگی سے زیادہ حساس ہوتی ہے۔ ہمیں کیسی کیسی نظروں کا سامنا ہوتا ہے۔ تم نا سمجھ نہیں ہو کہ ہر بات کھول کھول کر بتانی پڑے۔"

"ڈر کی وجہ پھر بھی سمجھ نہیں آئی۔" وہ ایک دم رکھائی سے بولا۔

"تم جانتے ہو۔"

"یعنی میرے بجائے اگر عرفان بھائی' رضوان یا حیدر میں سے کوئی آ بیٹھتا تو تمہیں پرابلم نہیں تھی۔"

"ہاں صحیح سمجھے ہو۔" خزران نے بلا جھجک کہہ دیا۔ بہت دنوں سے وہ اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ اس کے اور عازم کے بیچ اچانک ہی حد فاصلہ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ اب وہ ملائشیا سے واپس آ گیا تھا اور خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے آمنا سامنا بھی ہو جاتا تھا اور بات چیت بھی۔

"ڈرتا انسان تب ہے جب وہ کچھ غلط کر رہا ہو اور تم صرف اس لیے ڈرے جا رہی ہو کہ لوگ تم پر جھوٹا الزام لگا دیں گے۔"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مجھے احتیاط سے اور سنبھل کر رہنا ہے۔ پھر لوگوں کی زبانیں کہاں بولتی

ہیں۔ ان کی تو نظریں بولتی ہیں۔ ایسے میں ہم ایک ایک کو صفائی بھی نہیں دے سکتے۔" اس نے اپنا موقف وضاحت سے بتایا۔

"چلو' ٹھیک ہے' جب کبھی "ڈیٹ" پر جائیں گے' تو چوری چھپے نکلیں گے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"بہت بکواس کرتے ہو۔" خزران نے ایک غصے کی نظر اس پہ ڈال کر سامنے دیکھا۔

"تو... میں تو قسم سے بہت سنجیدہ ہوں... پھر تم بھی آزاد ہو اب تو... مسئلہ ہی کوئی نہیں۔" وہ مزے سے سیٹ سے ٹیک لگا کر اسے چھیڑنے لگا۔

"ہاں ٹھیک ہے' میں آزاد ہوں... اور تم؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"میں مرد ہوں اور مرد تو ہے ہی آزاد..."

"بڑا اترا رہے ہو... بتاؤں گی سارہ کو۔" اسے ہنسی آگئی۔

"ایک سنجیدہ بات کہوں۔" وہ سیدھا ہو کر اچانک اسے دیکھنے لگا۔ خزران کے دل کو کچھ ہوا۔ عازم کے ایسے انداز جانے کیوں اسے سالوں پیچھے لے جانے لگتے تھے۔

"کہو... تم کون سا چپ رہو گے؟"

"بڑا اعتراض ہے میرے بولنے پر... حالانکہ میں جب بھی بولا ہوں دوسرے کا بھلا ہی ہوا ہے... خیر اب میری بات دھیان سے سننا اور اس پر مثبت انداز میں غور کرنا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" خزران نے اس بار رویہ نرم رکھا۔

"تم جانتی ہو خزران! یاسر سے تمہاری شادی کے بعد میں نے خود کو پوری طرح اپنے آپ تک محدود کر لیا تھا۔ تمہاری ازدواجی زندگی پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا۔ بھلے تم سے بہت دور رہتا تھا لیکن رابطے میں رہنے کے بے شمار طریقے تھے' پھر بھی میں نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی اور وہ زندگی جو میرے نصیب میں لکھ دی گئی تھی' اسے ہنسی خوشی جینے لگا۔ لیکن اس سب کے باوجود میں نے ہمیشہ اپنی ایک عزیز دوست کو بہت مس کیا۔ تم سے دوستی کا رشتہ بہت مضبوط رہا تھا۔ اتنا مضبوط محبت کا رشتہ بھی ہوتا تو شاید تقدیر ہم سے جیت نہ پاتی... کیا اب زندگی کے اس موڑ پر میری دوست مجھے واپس مل سکتی ہے؟"

وہ اب اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے' اس نے بات مکمل کی۔ خزران نے اس کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔ لیکن جواب دینے میں شدید مشکل محسوس کی۔ لب چباتے ہوئے وہ مسلسل گاڑی چلاتی رہی۔

"بس یہاں آگے روک دو..." اس نے باہر دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔ خزران نے گاڑی روک دی۔

"مجھے جواب کی جلدی نہیں ہے... تم ہر پہلو پر غور کر لو... لیکن دیکھو میری نیت پہ شک مت کرنا۔"

"تمہاری نیت پر مجھے شک نہیں ہے عازم... لیکن۔" وہ قدرے رکی۔ "دوستی سے آغاز لینے والے رشتے کا انجام معلوم نہیں کیسا ہو... میں تمہیں الزام نہیں دے رہی... اپنی کمزوریوں سے خوف زدہ ہوں۔ اپنی ٹوٹی' بکھری زندگی کو خشک مزاجی کی ڈھال سے سہارا دیے ہوئے ہوں۔ میری ڈھال مجھ سے مت چھینو... میں تم سے ہر بات کہہ سکتی ہوں' اس لیے بہانے کا سہارا لینے کے بجائے صاف بات کی ہے... امید ہے میری مجبوری کو سمجھو گے۔"

وہ اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ عازم نے توجہ سے اس کو سنا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"میں تمہاری طاقت سے بھی واقف ہوں رازی اور کمزوریوں سے بھی' بے فکر رہو' میرا کردار ہمیشہ ایک بھلا چاہنے والے دوست کا ہی پاؤ گی۔" وہ کہہ کر اس کے جواب کے لیے نہیں رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔

☆ ☆ ☆

موسم کافی گرم ہو گیا تھا۔ جولائی کے آغاز کے دن تھے۔ اتوار کے دن اچانک آسمان بادلوں سے بھر گیا۔

بچے چڑیا گھر جانے کی ضد کرنے لگے۔ جنید بھائی بھی گھر پر تھے۔ خزران نے بچوں کو تیار کیا۔ خود بھی تیار ہوئی البتہ ڈرائیونگ کی ذمہ داری بھیا پر ڈال دی۔

بچے چڑیا گھر جا کر بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ خزران کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ اس نے شکر کیا کہ بچوں کو لے آئی' جب تک سسرال میں تھی۔ بچوں کے لیے بالکل وقت نہیں نکلتا تھا۔ شکر ہے قدرت نے بروقت اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔

کم از کم اس معاملے میں عازم واقعی رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ اگر وہ اسے جنید بھائی کے گھر آنے پر نہ اکساتا تو وہ اب بھی یاسر کے گھر سڑ رہی ہوتی۔ جہاں بچوں کی شخصیت' نری مسخ ہو رہی تھی۔ خزران نے مناہل کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکال کر سرہانے پر آہستہ سے اسے سلایا۔ سیدھا ہو کر لیٹتے ہوئے اس نے عازم کے لیے دل سے اولاد کی دعا کی۔ تقریباً سات سال ہونے والے تھے اس کی شادی کو۔ اللہ نے اب تک اسے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ سارہ بھی کچھ اسی وجہ سے الجھی الجھی اور پریشان نظر آتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج میں اپنی امی کے گھر جاؤں گی خزران! رات کو بھی وہیں رہوں گی۔ پنڈی سے باجی آئی ہوئی ہیں۔" وہ کالج سے لوٹی تو بھابی تیاری میں مصروف تھیں۔

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

بھابی کے جانے کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا' پھر رات کا کھانا بنا لیا۔ بچوں کا آج ویک اینڈ تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد فوراً سونے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔ اس لیے جنید ماموں کے ساتھ پلے اسٹیشن کھیلنے لگے۔ خزران انہیں ان کے حال پہ چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔

اتوار کا دن وہ کام والی کے ساتھ دوپہر تک کاموں میں لگی رہی۔ بھیا دوپہر کے کھانے کے بعد بھابی اور بچوں کو لینے چلے گئے۔ رافع بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

مناہل کو اس نے کارٹون چینل لگا کر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا۔ اور اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ چائے بنا کر اس نے جوں ہی کپ میں ڈالی' ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ بال سمیٹتی دروازے تک آئی۔

"کون.....؟"

"میں..... عازم.....!"

"عاز..... زی!" وہ ٹھٹھک کر ذرا دیر کو رکی پھر دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم.....!" اس نے راستہ چھوڑا۔

"وعلیکم السلام..... جنید ہے؟" وہ ایک قدم اندر آ کر رک گیا۔

"نہیں۔ وہ سمیعہ بھابی کو لینے گئے ہیں۔"

"اوہ..... تو تم اکیلی ہو۔" وہ چونکا۔

"ہاں..... بس میں اور مناہل..... جنید بھائی اور بھابی آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں بعد میں آ جاؤں گا۔" وہ واپسی کے لیے مڑا۔

"کوئی بات نہیں..... آ جاؤ۔" وہ کمرے کی طرف بڑھی تو عازم بھی پیچھے آنے لگا۔

"ویسے بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ آنے سے پہلے فون پر بتا دے۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی۔

"بس یار! عادت نہیں ہے..... اور جنید کی طرف تو اکثر ہی نکل آتا ہوں۔ اب تم آ گئی ہو تو آئندہ احتیاط کیا کروں گا۔"

"اچھا واہ..... اچانک بڑی تابع داری والی حس جاگ گئی۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ہاں..... تم ہی نے احساس دلایا کہ جہاں کسی کے معاملے میں دل میں کوئی بات ہو' وہاں احتیاط کرنی چاہیے۔" وہ روانی میں بولتا اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ خزران نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ایسا میں نے کب کہا.....؟"

"لو..... صاف صاف تو کہا تھا کہ اگر میرے بجائے کوئی اور آ کر تمہاری گاڑی میں بیٹھتا تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب اس کا اور کیا مطلب..... ویسے

بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اب دیکھو ناں.... بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں جنید سے ملنے یہاں آیا لیکن گھر پر صرف سمیعہ بھابھی ہوتیں.... لیکن ایسا ٹھنڈا میٹھا دل گدگدانے والا احساس کبھی نہیں جاگا جو ابھی تمہاری موجودگی...."

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے تھے۔ خزراں نے بنا سوچے اس کے کندھے پہ مکا مارا۔ "بدتمیز....!" اور وہ بجائے برا ماننے کے قہقہہ مار کر صوفے پہ جا بیٹھا اور مناہل کو گود میں لے لیا۔

"ہوں، تو منو کو ڈوریمان پسند ہیں۔"

"جی انکل.... بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ کو کون سے کارٹون پسند ہیں؟" مناہل بنا جھجکے اس کی گود میں سوار ہو کر سوال پوچھنے لگی۔ عازم کی شروع سے عادت تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ بہت جلد گھل مل جاتا۔ رافع اور مناہل کے ساتھ اس نے سویرا کی شادی میں اچھی خاصی دوستی بنالی تھی۔

"مجھے تو کنگ فو پانڈا، سمرف اور جنگل بک بہت پسند ہیں۔"

"تم کارٹون بھی دیکھتے ہو؟" عازم نے بڑی روانی میں بہت جلد جواب دیا تھا اس لیے وہ حیران ہو گئی۔

"ہاں اب تمہاری جدائی کا وقت کسی نہ کسی طرح تو کاٹنا تھا نا۔" اس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے مصنوعی آہ بھری۔ خزران نے تنگ آکر ماتھا پیٹا۔

"تم سے بات کرنا فضول ہے عازم.... ذرا بھی تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول نہیں ہے۔ اب چائے پیو اور چلتے بنو۔"

"ارے ایسے کیسے۔ ابھی تم نے کہا جنید آنے والا ہے۔"

"ہاں لیکن اچھا نہیں لگے گا۔ بس تم جاؤ۔"

"کیوں جاؤں.... مجھے تو جنید سے کام ہے۔"

"کیا کام ہے بھیا سے....؟" وہ زچ ہو گئی۔

"اس سے بائیک لینی تھی۔"

"لو اتنا سا کام تھا۔ وہ تو گاڑی لے گئے ہیں۔ بائیک پیچھے صحن میں کھڑی ہے، لے جاؤ۔"

"کیسی بے مروت ہو، کوئی ایسے بھی بھگاتا ہے۔ چائے تو پینے دو.... جانے کتنے برسوں بعد تمہارے ہاتھ کی بدمزا چائے دوبارہ پی رہا ہوں۔"

وہ پھر تنگ کرنے لگا۔ خزران نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔ چائے کے معاملے میں عازم اور اس کا مزاج قطعاً" الگ تھا۔ وہ گاڑھی، کم چینی والی چائے پیتی، جبکہ عازم کم دودھ، زیادہ شکر والی قدرے تیز چائے پسند کرتا تھا۔ ماضی میں عازم ہاتھ جوڑ کر منت کیا کرتا تھا کہ چائے بنانے وہ ہرگز کچن میں نہ جائے۔

"اب اچھی نہیں لگ رہی تو کیوں زبردستی پیے جا رہے ہو۔" وہ کھسیا گئی۔

"بتاؤں کیوں پی رہا تھا۔" وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری مخصوص بدمزا چائے مجھے ایک دم برسوں پیچھے لے گئی۔ ایک ایک گھونٹ مجھے کچھ نہ کچھ یاد دلا رہا تھا۔ خیر.... میں بائیک لے جا رہا ہوں۔ شام تک واپس لے آؤں گا۔" وہ باہر صحن میں نکل آیا۔

"دوسروں سے چیزیں مانگتے شرم نہیں آتی مہینوں گزر گئے تمہیں ملائیشیا سے واپس آئے.... اپنی بائیک یا گاڑی اب خرید ہی لو۔ سارہ بے چاری بھی تمہاری وجہ سے خوار ہوتی پھرتی ہے۔" خزران ساتھ ساتھ چلتے اس کی کلاس لینے لگی۔

"فی الحال بائیک لے رہا ہوں.... گاڑی ذرا ٹھہر کر۔" اس نے چابی گھما کر اسٹینڈ اٹھایا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ سارہ کو اس کی امی کے گھر چھوڑنا ہے۔"

"ایک بات کہوں عازم! برا نہ ماننا۔"

"ہاں کہو.... تمہاری بات کا کبھی برا نہیں مانا۔" وہ جاتے جاتے رکا۔

"مجھے محسوس ہوا ہے کہ سارہ اپنا زیادہ وقت میکے میں گزارتی ہے۔ کیا تم اسے خوش نہیں رکھتے؟"

"چلو.... میکے وہ جاتی ہے اور بلیم تم مجھے کر رہی ہو۔ یعنی تمہیں لگتا ہے اس میں بھی میرا قصور ہے۔"

"عورت کی ازدواجی زندگی پرسکون ہو تو اسے اپنے گھر کے علاوہ کہیں سکون نہیں ملتا۔" خزراں نے وضاحت کی۔

"ہاں - وہ بے سکون تو ہے لیکن..." وہ لحظے بھر کو رکا۔ "چلو اسے، پھر کبھی ڈسکس کریں گے۔ ویسے بھی تم نے میری دوستی کی آفر پر غور نہیں کیا... اب کیا دروازے پہ کھڑے کھڑے اپنے پرسنلز تم سے شیئر کروں۔ کبھی فون پہ بات کرنے کا وقت نکالو۔"

وہ کہہ کر مزید نہیں رکا اور بائیک نکال لے گیا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے اپنی سی وی ایک پرائیویٹ اسکول میں بھیجی تھی۔ وہاں سے انٹرویو کی کال آئی ہے۔" لنچ کے دوران سارہ نے پرسکون انداز میں عازم کو اطلاع دی، لیکن اس کا کھانے کی طرف بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے کچھ سوچا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"کس کے مشورے سے سی وی بھیجی تھی۔" اس کا لہجہ ایک سنجیدہ تھا۔ سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عازم سے، ایسے جملے کی وہ ہرگز توقع نہیں کر رہی تھی۔ سی وی بھیجنے کی اطلاع بھی یونہی دے دی کہ اگلی صبح انٹرویو کے لیے اسی کے ساتھ جانا تھا۔

"کیا مطلب... میں نے تو ملائشیا سے آتے ہی کافی جگہوں پر اپلائی کر دیا تھا۔"

"لیکن کیوں... ملائشیا سے جاب چھوڑ کر تو میں آیا ہوں۔ یہاں بھی یہ کام میرے کرنے کا ہے۔ تم بلاوجہ کیوں فکر مند ہو رہی ہو۔"

"میں تو یونہی، وقت گزاری کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں۔ گھر کا بوجھ اٹھانا میرا مقصد نہیں ہے۔"

"وقت گزاری کے لیے تمہارا خاندان ہی کافی ہے۔ جہاں تم روز صبح ملنے نکل کھڑی ہوتی ہو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی تو سارہ نے بمشکل ضبط کیا۔

جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ عازم جیسا لبرل 'عورت کی آزادی کا حامی' بیوی کے معاملے میں اتنا تنگ نظر نکلے گا' اس نے سوچا نہیں تھا۔ تو کیا سات سال میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔ ملائشیا میں سارہ کے لیے نہ تو جاب کرنے کا ماحول تھا اور نہ اس نے ایسی کوشش کی تھی' اس لیے عازم کے خیالات جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ خواتین کے متعلق اس کی عمومی رائے ہمیشہ سے یہی تھی کہ انہیں پڑھنا بھی چاہیے اور باہر بھی نکلنا چاہیے' لیکن آج وہی عازم عجیب متضاد باتیں کر رہا تھا۔

"آپ میری جاب کے خلاف کیوں ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ گھر پر اکیلے وقت گزارنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔"

"تم نے خود ہی اپنے لیے زندگی مشکل بنالی ہے۔" عازم نے قدرے ناراض لہجے میں کہا۔ "فضہ بھابھی پچھلے سال اپنی دو دن کی اریبہ تمہاری گود میں ڈال رہی تھیں' لیکن اسے ہاتھ لگاتے ہوئے تمہیں بچھو کاٹ رہے تھے۔ بچے تو معصوم فرشتے ہوتے ہیں' کیا تھا اگر ہم اسے گود لے لیتے' ہمارا اپنا خون تھا وہ... کیا پتا اس کی برکت سے اللہ ہمیں حقیقی خوشی سے بھی نواز دیتا، بندہ اتنا ناشکرا بھی نہ ہو۔" وہ بدمزا سا ہو کر ٹیبل سے اٹھ گیا۔

"ایسی بے وقت کی بحث کو اس وقت بیچ میں لانے کا کیا مطلب عازم! سیدھے سیدھے کہہ دیں آپ کو میرے جاب کرنے سے پرابلم ہے۔ بچے کو بیچ میں کیوں لا رہے ہیں۔ عرفان بھائی کی بیٹی کو میں نے اس لیے گود نہیں لیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا بچہ لینے کے باوجود میری پریشانی جوں کی توں رہے گی۔ اب میں اپنا ذہن نہیں بنا پا رہی تھی تو اس میں میرا کیا قصور۔"

وہ رو دینے والی ہو گئی تو عازم نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کیا۔

"ٹھیک ہے... لیکن جاب کی بات بھول جاؤ... نہ تمہیں روپے پیسے کی کوئی کمی ہے اور نہ کہیں آنے جانے کی پابندی... ہمارے درمیان اس موضوع پر دوبارہ کوئی بحث نہیں ہو گی۔"

وہ قطعی انداز میں کہتا باہر نکل گیا اور سارہ نے زور سے چمچے کو پلیٹ پہ پٹخ کر اپنا غصہ نکالا۔

☆ ☆ ☆

لاہور کینال کے پاس بیٹھے عازم کو شاید ایک گھنٹے

سے زیادہ ٹائم ہو گیا تھا لیکن خاموشی سے لہروں کو تکتے وہ ابھی بھی وہاں سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے قریب سے ایک کنکر اٹھا کر نہر میں پھینکا اور دور تک پھیلتے دائروں کو دیکھنے لگا۔ آج اس کا دل بہت افسردہ اور بے چین تھا۔ نوکری کے معاملے پر سارہ سے جھگڑا کرنے کے بعد اس کے اور سارہ کے بیچ تین اور معاملات کو لے کر مزید کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ نتیجتاً" وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔ کتنا مشکل ہے ایک ایسی لڑائی لڑنا' جو غصے سے زیادہ کسی پلاننگ کا حصہ ہو۔ بے سر پیر کی ان لڑائیوں کا مقصد ایک ایسی جنگ جیتنا تھا جس میں ہار جانے کس کی تھی۔

موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ "خزران... ایک عجیب سی سرخوشی نے پورے وجود کا احاطہ کیا۔ اس نے یس کیا۔

"کیسی ہو مہربان دوست۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"بالکل ٹھیک' الحمدللہ... تم سناؤ' فارغ ہو؟"

"ارے ایسا ویسا..." وہ ہنسا "بس ایک کشتی اور چپو کی کمی ہے۔"

"کیا مطلب... کہاں ہو تم...؟" وہ حیران ہوئی۔

"نہر کنارے بیٹھا ہوں... تیراکی تو جانتا نہیں... سوچ رہا ہوں کشتی ہوتی تو سیر کا مزا آجاتا۔"

"عجیب سر پھرے آدمی ہو... سارہ بے چاری کو ناراض کر کے میکے بٹھا دیا اور یہاں نہر کنارے بیٹھے مزے اڑا رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے۔" وہ غصہ ہو گئی۔

"او... تو تمہاری ہمدرد طبیعت نے سارہ کی خاطر جوش مارا ہے۔ وہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ فون میں پہل کرنے کی رگ تم میں کیسے پھڑکی۔" وہ باقاعدہ طنز کرنے لگا۔

"اچھا فضول نہ بولو... سچ کہو کیا معاملہ ہے...؟"

"تمہارے ذرائع نے "معاملہ" بھی بتا دیا ہوگا۔" وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"بس صرف تمہاری بات پر یقین کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے معاملے میں' سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔"

"چلو تھینکس... تمہارا اتنا کہنا کافی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہوئی عازم! کہ دس روز ہو گئے۔ نہ وہ واپس آرہی ہے نہ تم اسے منانے جا رہے ہو۔ انا پرستی سے تو معاملہ اور بگڑے گا۔ تم اسے واپس لے آؤ۔"

"یہ انا کی جنگ نہیں ہے رازی... یہ تو فاصلوں کی دیوار ہے' جو روز بروز اونچی ہوتی جا رہی ہے۔"

"میں تمہارے ذاتی معاملات کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتی اور نہ اس میں پڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تم ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرو... مسائل بھی ہر گھر میں ہوتے ہیں اور چھوٹی موٹی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں... بہتر ہوتا ہے کہ ہر معاملے کو ایک دوسرے سے ڈسکس کر کے آپس میں سلجھا لیا جائے۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے سمجھانے لگی۔

"ہوں... ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عازم نے ایک گہری سانس لی۔

"وعدہ کرو' سارہ کو آج ہی واپس لے آؤ گے۔"

"اچھا... وعدہ بھی کرنا ہے۔" عازم ہنس پڑا۔

"ہاں... پکا پرامس۔" خزران بھی مسکرانے لگی۔

"اوکے آج ہی لے آؤں گا... خوش؟" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

خزران نے تھینک یو کہہ کر فون رکھ دیا اور عازم فون کو تکتے ہوئے اس کے پُرخلوص جذبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہاں سے اٹھا تو دل ایک دم بہت ہلکا پھلکا سا لگنے لگا۔ وہ جیسے اڑتا ہوا گھر پہنچا۔ جانے کیا تھا خزران کی آواز میں... وہ ہمیشہ یونہی مطمئن اور پرسکون سا ہو جاتا تھا۔ کوئی پریشانی' پریشانی نہیں لگتی تھی۔ اور نہ کوئی غم پہاڑ جیسا۔

"خوش رہو رازی... تمہارے ہوتے مجھے کسی اپنے کی ضرورت نہیں' تم قریب ہو' آس پاس ہو' تمہاری موجودگی کے احساس سے میری زندگی پھر سے بھر گئی ہے۔"

وہ اسی شام سارہ کو واپس لے آیا۔ محض اس لیے

کہ خزران نے وعدہ لیا تھا۔ سارہ بھی شاید واپس آنے پر آمادہ تھی اس لیے بنا حیل و حجت ساتھ چل پڑی۔



عازم کو ملائشیا سے آئے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ جاب کا سلسلہ تو ابھی تک نہیں بن پایا تھا۔ اس نے کاروبار کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ دوستوں سے مشورے کے بعد اور ذاتی شوق کو دیکھتے ہوئے اس نے موٹر سائیکلوں کا اپنا شوروم کھول لیا۔ ابا چونکہ آٹو اسپیئر پارٹس کے کاروبار سے منسلک تھے تو انہوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ عازم کا وقت اچانک ہی بہت مصروف گزرنے لگا۔ تقریباً پورا دن شوروم کی نذر ہوجاتا۔ صحیح معنوں میں اس کے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ بہت دنوں یا شاید ہفتوں سے خزران کا بھی کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ وہ روز ہی جنید کی طرف جانے کا ارادہ کرتا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت قدم روک لیتی۔

ادھر خزران کی گجرات ٹرانسفر ہوگئی۔ فوری طور پر وہ کافی گھبرائی۔ اسے زیادہ پریشانی بچوں کی وجہ سے تھی۔ لیکن پھر عازم کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا جہاں بھی ٹرانسفر ہو خود بھی وہیں رہنا اور بچوں کو بھی ساتھ رکھنا۔

اس نے بچوں کو دو روز کے لیے بھیا، بھابی کے حوالے کیا اور اللہ کا نام لے کر نئی جگہ روانگی اختیار کی۔ جگہ کے متعلق اسے پرانی کولیگز سے کافی ساری معلومات پہلے ہی مل گئی تھیں۔ باقی ماندہ پریشانیاں یہاں آکر خود بخود حل ہوگئیں۔ بچوں کے لیے اسکول بھی قریب ہی مل گیا اور رہائش کے لیے گھر بھی بہت اچھا ملا۔ ضروری سامان وغیرہ سیٹ کرکے وہ بچے لے گئی۔

شروع شروع میں ہر ویک اینڈ پہ لاہور آتی لیکن رفتہ رفتہ دو سے تین ہفتے بعد کی روٹین بنالی۔ گجرات آئے اسے تیسرا مہینہ تھا۔ پچھلی اتوار کو جب وہ لاہور گئی تو میعہ بھابی سے سنجیدہ پھپھو کی خرابی طبیعت کا پتا چلا۔ وہ پھپھو کی عیادت کو چلی گئی۔ وہاں عازم بھی موجود تھا۔

خزران کی بڑے عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ تو حسب معمول بہت خوش ہوا تھا اسے دیکھ کر لیکن خزران نے اپنا رویہ جان بوجھ کر سرد رکھا اور زیادہ بات چیت نہیں کی کیونکہ فضہ بھابی سے پتا چلا کہ سارہ ایک مرتبہ پھر روٹھ کر میکے جاچکی ہے۔ عازم نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ کچھ کھنچی کھنچی سی ہے اس لیے رات کو ہی فون کردیا۔ وہ جنید بھائی کے گھر تھی۔

"کیا بات ہے رازی... کیوں ناراض ہو؟" وہ نہایت رسان سے پوچھنے لگا۔

"حیرت ہے۔ مجھ سے، وجہ پوچھ رہے ہو؟" وہ الٹا خفا ہوگئی۔

"یار! اب میرا کیا قصور' اسے خود ہی شوق ہے میکے جا بیٹھنے کا۔" عازم نے بننے کی کوشش نہیں کی اور وضاحت دینے لگا۔

"ایسا نہیں ہوتا عازم... اس سب میں کہیں نہ کہیں ضرور تمہاری کوتاہی ہے۔ تمہارے اندر تو لوگوں کو جانچنے پرکھنے کی زبردست کوالٹی ہے۔ ایک ہی نظر میں تم اندر تک ہو آتے ہو۔ کیوں تم اب تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ سارہ کی تم سے کیا توقعات ہیں۔ کیوں تم اسے وہ اعتماد اور بھروسا نہیں دے پائے' جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے۔" خزراں نے ساری خطائیں اس کے حصے میں ڈال دیں۔ عازم مسکرانے لگا۔

"شاید انڈر اسٹینڈنگ کی کمی..." اس نے اختصار سے کام لیا۔ غالباً اس موضوع پر بولنے کا موڈ نہیں تھا۔

"اچھا اب غصہ ختم ہوگیا ہو تو میں کچھ پوچھوں؟"

"ہاں کہو...."

"کچھ نئی جگہ کے متعلق بتاؤ... بچے سیٹ ہوگئے۔ کیسا ماحول ہے کیا کرتی رہتی ہو؟"

"ہاں اچھی جگہ ہے۔" اس نے لہجہ نارمل کیا۔

"شروع شروع میں بہت گھبراتی تھی... کیونکہ اتنی دور کا پہلا تجربہ ہے... لیکن شکر ہے زیادہ کوئی مسئلہ نہیں

ہوااور بچے بھی سیٹ ہو گئے۔"

"اور تم۔۔۔؟"

"میں۔۔۔" وہ ہنسی۔ "میرا تو کام ہے ناں۔۔۔ مجھے تو ہر جگہ جیسے تیسے سیٹ ہونا ہی پڑے گا۔"

"وہاں وقت کیسے گزرتا ہے۔" وہ پوری توجہ اور دھیان سے اس کے متعلق جاننا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ سارے سوال بظاہر کافی فارمل سے تھے، لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ واقعی خزران کی ترجیحات اس کے شب و روز کے متعلق سننا چاہتا ہے۔

"بس دن کا وقت کالج، دوپہر کے وقت سے رات گئے تک بچوں کے ساتھ مصروف' ماحول یہاں کا بہت پرسکون اور اچھا ہے۔ فارغ وقت کبھی ٹی وی دیکھتے کبھی کتابیں پڑھتے گزر جاتا ہے۔" وہ تفصیل بتانے لگی۔

"اتنی فارغ رہتی ہو تو کبھی بات بھی کر لیا کرو۔" وہ بے ساختہ شکوہ کر بیٹھا۔

"میں اپنی عادتیں خراب نہیں کرنا چاہتی۔" وہ مسکرانے لگی۔

"بہت عجیب ہو۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تو خزران حیران ہو گئی۔

"کیا مطلب؟"

"مجھ سے جھگڑا کرنا ہو تو اتنے اپنوں کے سے انداز میں ہو کہ ایسے، تو سارہ بھی نہیں لڑتی۔ لیکن جب مجھے کسی معاملے میں تمہاری مدد چاہیے ہو' کچھ مشورہ کرنا ہو یا تم سے کچھ شیئر کرنا چاہوں تم اتنی دور کھڑی دکھائی دیتی ہو جیسے دو اجنبی۔"

"ایسا ہمیشہ سے تو نہیں ہے عازم۔" اس نے فوراً کہا۔ "وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ وقت نہیں ہے کہ تم گھنٹوں تجھ سے فون پر گپیں لڑاؤ۔"

"بنا سوچے کچھ بھی بول دیتی ہو۔ تمہارا مطلب ہے میں تمہیں بہکانا چاہتا ہوں یا ٹائم پاس کرنا چاہتا ہوں۔" وہ سخت برا مان گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ لیکن تم سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرنا بھی میں بالکل صحیح نہیں سمجھتی۔"

"مشکل میں کسی دوست کی مدد چاہنا اور بات ہے اور لمبی لمبی گپیں لگانا اور۔۔۔ لیکن خیر تم تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ تمہاری اس ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا لیکن آج کے بعد نہیں۔ آئندہ تمہاری پریشانیوں میں اضافے کا باعث کم از کم عازم حیدر کی ذات نہیں ہو گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔"

عازم کا انداز اتنا قطعی اور ٹھوس تھا کہ خزران نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔۔۔ اور وہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ جب کسی عورت کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ اس کی محبتوں کے صلے میں صرف درد اس کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ تکلیف کی کیسی انتہاؤں پر پہنچ جاتی ہے۔ اندر کی توڑ پھوڑ جب لاوے کی صورت ابلتی ہے تو کوئی برائی' برائی نہیں لگتی' ہر انتقامی کارروائی جائز اور ہر منفی اقدام اپنا حق محسوس ہوتا ہے یا سر کی دھوکا ہی سے چوٹ کھائی خزران نے اب تک ہر مرحلے پر خود کو نارمل رکھا تھا۔ ہر وقت خود کو مصروف رکھتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اپنی محرومیوں پر سوچ بچار کرنے کے بجائے وہ صرف اپنے بچوں پر دھیان دے۔ عازم کے دوستی کے لیے بڑھائے ہاتھ کو بھی اس لیے جھٹک دیا کہ اب وہ اپنے خیالات میں کسی قسم کی اکھاڑ پچھاڑ کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ عازم تو پھر اس کی پہلی محبت تھا۔ اگر وہ اپنے دل کو اس کی طرف مائل ہونے سے نہ بچا سکی تو۔۔۔

عازم کی تو عادت تھی کہ اکثر آتے جاتے مذاق کے انداز میں کوئی شگفتہ جملہ کہہ جاتا یا ہلکا پھلکا اظہار کر جاتا تو وہ گھنٹوں خود کو اس جملے کے سحر میں جکڑا محسوس کرتی۔ عازم سے اپنا ذہن ہٹانے کے لیے گھنٹوں خود سے لڑتی' اپنے حالات اور بچوں کی طرف دیکھ کر اپنے ضمیر کو جگانے کی کوشش کرتی۔ عازم کے لیے بے اختیار لپکتے اپنے دل کو کئی جتن کر کے مناتی۔ اور آج وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا تو خزران کے دل کو ایک لحظے کے لیے قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے زبردستی خود کو فون کرنے سے باز رکھا۔ اور ایسے وقت

میں جبکہ اس کی بیوی بھی گھر میں نہیں تھی۔ جو بھی ہو، وہ ایک مرد تھا... خزران ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر عازم کی ناراضی کا بوجھ دل پہ لیے وہاں سے اٹھ گئی۔



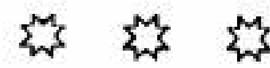
دو ماہ مزید گزر گئے۔ اس دوران وہ تقریباً" تین چار مرتبہ لاہور ہو آئی۔ لیکن عازم سے ایک بار بھی سامنا نہیں ہوا۔ ان ہی دنوں ایک دن سمیعہ بھابھی نے فون پر بتایا کہ عازم نے سارہ کو طلاق دے دی ہے۔

"کیا...؟" خزران کی حیرت سے چیخ نکل گئی۔

"طلاق" کا لفظ کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے... یہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا... پھر عازم اور سارہ کی طلاق... جانے بھابھی اور بھی کیا کچھ کہتی رہیں... وہ شدید صدمے سے دوچار کچھ بھی سن نہیں پائی۔

"تو تم بھی عام مرد نکلے عازم... کیا فرق رہا تم میں اور یاسر میں... اور کیا فرق ہے مجھ میں اور سارہ میں... اسے بھی ایک ایسے قصور کی سزا ملی جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ زندگی میں دو ہی مردوں پر بھروسا کیا اور انہی دو کو محبت کے قابل بھی جانا، لیکن یاسر کی بے وفائی کے بعد اس بات کا تو گمان بھی نہیں کیا تھا کہ ایک دن عازم بھی ویسا ہی کرے گا۔ شاید اس معاملے میں میرا نصیب ہی برا ہے یا شاید دنیا کا ہر مرد ہی برا ہے... مجھ سے لمبی بات کرنے کے لیے مہینوں سے وقت مانگ رہے تھے، تو یہ کہنا چاہتے تھے... طلاق کا مشورہ مانگ کر اپنے خیالات مجھ تک پہنچانا چاہتے تھے۔"

وہ خیالوں میں گم دیر تک ایسی ہی باتیں سوچے چلی گئی۔ البتہ ایک بات پر بار بار شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا عازم سے دوستی پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی ورنہ ایسے حالات پیدا ہونے کی ذمہ دار خود کو ٹھہراتی رہتی۔



بچوں کے اسکول اور اس کے کالج کی چھٹیاں ہو گئیں تو وہ سب لاہور آ گئے۔ خزران اور بچوں کو بھی دو ماہ کا آرام مل گیا تھا۔ ہفتہ بھر ہی گزرا تھا اسے آئے کہ ایک دن فضہ بھابھی اچانک اس سے ملنے کے لیے آ گئیں۔

"تم تو فون تک کرنے کی زحمت نہیں کرتیں۔ اماں نے کہا خود جا کر خزران کو لے آؤ۔"

"سوری بھابھی، میں بس ایک دو روز میں آنے ہی والی تھی۔ پھپھو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ انہیں ساتھ لیے کمرے میں آ گئی۔

"شکر ہے... اب تو بہت بہتر رہتی ہے... تم سناؤ فی الحال تو یہیں ہو ناں؟"

"جی بھابھی! دو مہینے یہیں ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، پھر اس خوشی میں جلد از جلد کوئی دن طے کرو۔ تمہیں کھانے پر انوائیٹ کرنے آئی ہوں۔"

فضہ جب عرفان کی دلہن بن کر سنجیدہ پھپھو کے گھر آئیں تو انہوں نے خزران کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ تمہاری دیورانی ہے۔ تب عازم اور اس کا رشتہ ہو چکا تھا۔ اس لیے فضہ بھی کبھی کبھار اسے دیورانی کہہ کر بلا لیا کرتیں... بہرحال وہ خطاب تو یاسر سے شادی کے بعد خود بخود چھن گیا... لیکن خزران کا فضہ بھابھی سے دوستی کا رشتہ جوں کا توں قائم تھا۔ بہت دیر بھابھی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے بالآخر خزران نے خود ہی عازم اور سارہ کی طلاق کا موضوع چھیڑ دیا۔

"ہاں اب تو بات پرانی بھی ہو گئی۔" فضہ نے ایک آہ بھری۔

"ایسا کیا ہوا تھا بھابھی کہ نوبت علیحدگی تک آ پہنچی؟"

"بس خزران! ہمیں تو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ کب ان کے معمولی معمولی جھگڑے اتنی سنجیدہ نوعیت اختیار کر گئے۔"

"پھوپھو اور پھوپھا نے بھی معاملہ سلجھانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"جب میاں بیوی ہی آپس میں مصالحت کو تیار نہیں تھے، وہ بے چارے... کیا کرتے؟"

"اور عازم... وہ کہاں ہے آج کل؟" خزران پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"یہیں ہے... دن میں اپنے شوروم پر ہوتا ہے۔

رات کو کھانا ہماری طرف کھاتا ہے۔ بس سونے کے لیے اپنے گھر چلا جاتا ہے۔"

"کیا لگتا ہے بھابھی! اس معاملے میں کون قصوروار تھا۔" دل کے بہت اندر ایک من چاہی خواہش بکل مارے بیٹھی تھی کہ کاش کوئی کہہ دے عازم مظلوم تھا اور سارہ قصوروار۔

"میرا خیال ہے اگر عازم چاہتا تو اس رشتے کو قائم رکھ سکتا تھا۔" فضہ بھابھی نے بہت سوچ سوچ کر الفاظ کا چناؤ کیا۔ خزران کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ اگلے روز الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی جب وہ اچانک ہی اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"تم...؟" وہ بالکل گڑبڑا گئی۔ عازم ہنستے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ڈر تو ایسے لگئیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔"

"کیا مطلب، چوری پکڑی گئی؟" وہ خفا سی اپنے کام میں لگی رہی۔

"بھئی جب کوئی کسی کے بارے میں سوچ رہا ہو اور وہ اچانک سامنے آجائے تو کچھ ایسا ہی ردعمل ہوتا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر مزے سے ٹیک لگائی۔

"تمہارے بارے میں سوچتی ہے میری جوتی۔" وہ ٹھیک ٹھیک غصہ کھا گئی۔ "اور یہ کیا تم سیدھے میرے کمرے میں گھس آئے۔ شرم نہیں آتی۔ سمیعہ بھابھی کیا سوچیں گی... چلو اٹھو یہاں سے..."

"بہت ناراض ہو...؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

"میرا تم سے روٹھنے منانے کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ زیادہ سوچو مت..." وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کزن کا رشتہ تو ہے ماموں زاد کی حیثیت سے بات سن لو۔"

"کہو...؟" خزران نے کمرے کی چوکھٹ سے کندھا ٹکاتے ہوئے بدستور روکھے لہجے میں کہا۔

"کیا تم نہیں جاننا چاہتیں کہ میں نے سارہ کو طلاق کیوں دی؟"

"تمہارا ذاتی معاملہ ہے... میں کیا کروں گی جان کر... ویسے بھی اب کیا فائدہ... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"ہاں، لیکن میرے حساب سے تمہارے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔" وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں...؟" وہ چونکی۔

"کچھ دنوں تک خود ہی جان لو گی۔" اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"اب اس کا کیا مطلب...؟" وہ الجھی الجھی چند قدم آگے آئی۔

"اگر تمہیں ہماری آخری گفتگو یاد ہو تو میں نے کہا تھا کہ تمہاری ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ حیرت ہے تم نے اب تک غور نہیں کیا کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا؟" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایڑیوں پہ گھوما تھا اور اب سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "اب بھی یہی کہوں گا بے کار کی ضد چھوڑو... خود پر پابندیاں لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ذہنی مریضہ بن جاؤ گی۔ نارمل زندگی گزارنے کے بارے میں سوچو، آزاد ہو تو آزادی محسوس بھی کرو۔"

وہ کچھ مبہم، کچھ ظاہری سی گفتگو کر کے باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ سوچوں کے گرداب میں پھنس گئی۔ "تو کیا اس دن وہ سارہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں سختی سے اسے طلاق کے فیصلے سے روکتی تو ہو سکتا ہے وہ سارہ کو نہ چھوڑتا... تو کیا میں قصوروار ہوں؟"

وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور کڑیاں ملانے لگی۔

"اور اس بات کا کیا مطلب ہے کہ میں خود پر پابندیاں لگانا چھوڑ دوں۔ اب اس بات کا کیا مطلب... اور..." وہ چونکی... "اور اس نے کہا کہ نارمل زندگی گزارنے کے بارے میں سوچو... تو کیا اب وہ مجھ سے کوئی توقع باندھنے کی سوچ رہا ہے..." اچانک الجھی گرہ سلجھنے پر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہرگز نہیں... میں اس جیسے خود غرض اور دوغلے انسان سے ہرگز رشتہ نہیں جوڑ سکتی۔ اب تو تمہارے

چہرے پر پڑا نقاب اتر چکا ہے عازم۔۔۔ میں مسائل سے بھری زندگی کا یہ کوہ ہمالیہ اکیلے سر کرلوں گی لیکن تمہارا ساتھ، تم بھیک میں بھی مانگو تو نہیں دوں گی۔ تم آج سے خود کو میری سوچوں سے بھی بے دخل سمجھو۔۔۔ تمہارے، نام سے جڑنا مجھے موت تک قبول نہیں۔ کبھی نہیں۔۔۔" وہ جذباتی ہو کر رو پڑی تھی لیکن پھر خود ہی سختی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

☆ ☆ ☆

آج وہ دو ماہ بعد گجرات کے سفر پر رواں دواں تھی۔ عازم اس دن کے بعد دوبارہ جنید بھائی کے گھر نہیں آیا۔ اتنی کم مدت میں کیسے کیسے روپ دیکھ لیے تھے لوگوں کے۔۔۔ اعتماد، بھروسا اور خلوص جیسے الفاظ اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اپنی احمقانہ سوچوں پر اس کا دل چاہتا خود کو بے وقوفی کا میڈل دے۔۔۔ رافع اور مناہل کو ان کے ددھیال سے دور نہ کرنے کی خاطر ان کے گھر سے چپکی رہی۔ جبکہ سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ وہاں سے کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی کہ جیتی ہو یا مر گئی۔ جاننے والوں سے البتہ خزران کو یہ خبر ملی کہ اس کے گھر چھوڑنے کے ایک ماہ بعد ہی یاسر اپنی نئی بیوی کو پاکستان لایا تھا اور کافی دھوم دھام سے ولیمہ کیا گیا تھا اور اب اس کی بیوی امید سے تھی۔ اف۔۔۔ وہ ایک جھرجھری لے کر کھڑکی کے پار گزرتے مناظر کو دیکھنے لگی۔ کیسی کیسی تلخ حقیقتوں کا زہر اپنے اندر اتارنا پڑتا ہے۔

کیسی حساس اور نازک ہوا کرتی تھی اماں ابا کے گھر، لاڈلی، ضدی اور حاوی ہو جانے والی۔۔۔ اور اب۔۔۔ ہر خوشی ہر آسائش کو اس نے خود پر حرام کرلیا تھا۔ دل تھا کہ خواہشات سے خالی گھر بنتا جارہا تھا۔ جانے اللہ تعالیٰ کو اس کی کون سی نیکی پسند آئی تھی کہ اس نے حوصلے، ہمت اور صبر کی دولت عطا فرمادی تھی۔ ورنہ اسے وہ دن بھی یاد تھے جب یاسر سے نئی نئی علیحدگی ہوئی تھی تو اسے ہر وقت مرنے، مارنے کی باتیں سوجھا کرتی تھیں۔۔۔

اسے گجرات آئے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا لیکن اس تیزی میں بھی ایک سکون، ایک ٹھہراؤ تھا اسی لیے وہ خوش تھی۔ مناہل اور رافع ایک درجہ اوپر کی جماعت میں آگئے تھے۔

وہ اس وقت بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی جب سمیعہ بھابھی کا فون آگیا۔

"کام تو نہیں کر رہی تھیں۔" انہوں نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"جی نہیں۔۔۔ آپ سنائیں بھیا کیسے ہیں؟"

"ہاں، وہ ابھی گھر کا کچھ سامان وغیرہ لینے باہر گئے ہیں۔ انہوں نے میرے ذمے ایک کام لگایا تھا، سوچا فارغ بیٹھی ہوں تم سے، تسلی سے بات کرلوں۔"

"خیریت بھابھی! کون سا کام۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"وہ۔۔۔ دراصل تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔" سمیعہ نے جھجک کر بات کا آغاز کیا۔ خزران نے جواباً خاموش رہ کر انہیں بات جاری رکھنے دی۔

"سنجیدہ پھپھو نے جنید کو گھر بلایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں اور عازم کی بھی یہی مرضی ہے۔۔۔ جنید نے مجھ سے کہا کہ پھپھو کے پیغام سے تمہیں آگاہ کردوں۔" وہ بات مکمل کرکے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگیں لیکن خزران بالکل خاموش تھی۔

"ہیلو۔۔۔ خزران! سن رہی ہو۔۔۔؟"

"جی بھابھی!"

"کیا ہوا؟ ایسے چپ کیوں ہوگئیں۔۔۔ جنید کا خیال یہ ہے کہ تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے کیوں کہ بچے ابھی ناسمجھ ہیں۔ اگر اس اسٹیج پر تم کسی اچھے بندے کو اپنی زندگی میں شامل کرلو تو زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر عازم ہمارا دیکھا بھالا اور اپنا ہے۔"

"بھابھی! میں فیصلہ کرچکی ہوں کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔ میں الحمدللہ کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ باعزت روزگار سے وابستہ ہوں۔ بلاوجہ اپنی پرسکون زندگی میں ہلچل کیوں پیدا کروں؟"

"پلیز خزران! جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ اپنی عمر دیکھو اور سوچو کہ اکیلے یہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ یہ رشتہ تو جیسے، اپنے گھر کی بات ہے۔" سمیعہ نے اپنی طرف سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں بھابھی! میرا فیصلہ قطعی ہے اور جہاں تک عازم کی بات، ہے تو آپ جانتی ہیں' وہ میرا منگیتر تھا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ' بھیا یا اور کوئی بھی اس رشتے کے بارے میں سنے گا تو فوراً اس کے حق میں ووٹ دے گا' لیکن اگر آپ میری رائے پوچھیں تو میں اس سے شادی کے لیے کبھی ہامی نہیں بھر سکتی' بلکہ عازم کے علاوہ اگر کسی اور کا رشتہ آیا ہوتا تو شاید میں سوچنے کے لیے وقت بھی لے لیتی' لیکن عازم کے لیے بالکل نہیں۔" اس نے کھل کر اپنی رائے ان تک پہنچادی۔

"اوہ!" سمیعہ نے ذرا دیر کو کچھ سوچا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارا جواب جنید کو بتادوں گی۔ اوکے پھر بات کروں گی تم سے۔"

"جی۔ ٹھیک ہے۔" اس نے فون رکھ دیا۔ "عازم سے شادی" وہ جملہ تھا' جس پر ماضی میں وہ لال گلابی ہوجایا کرتی تھی' لیکن آج اسی عازم کا ایک بار پھر رشتہ آیا تو انکار کرتے' ہوئے لمحہ نہیں لگایا تھا۔ اس نے ایک آہ بھر کر تصور میں عازم کو مخاطب کیا۔

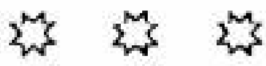
"اگر تم نے میرا ساتھ پانے کے لیے سارہ کو طلاق دی ہے تو میں کہوں گی اللہ بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ سارہ کی محبت کے مزار پر میں اپنی خوشیوں کا محل ہرگز کھڑا نہیں کروں گی۔"

شام کو جنید بھائی کا فون آگیا۔ وہ اسے ہر طرح سے سمجھانے لگے' لیکن خزران نے ہتھیار نہیں ڈالے اور صاف کہہ دیا کہ پھپھو کو میرا جواب پہنچادیں۔ جنید نے مجبوراً اس کا انکار عازم اور پھپھو تک پہنچادیا۔

تقریباً ایک مہینے سے وہ لاہور نہیں گئی تھی۔ بھیا' بھابھی نے بہت بار بلایا کہ ایک چکر لگا جاؤ' لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتی رہی۔

ان ہی دنوں ایک بار پھر سمیعہ بھابھی رشتہ لے آئیں۔ جنید بھائی کے جاننے والوں میں سے تھے۔ ثاقب حسن نام تھا اور محکمہ زراعت کا اعلا افسر تھا۔ اس کی پہلی بیوی کا کچھ سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا اور ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔

جنید نے اپنی طرف سے تسلی کرلی تھی۔ لوگ بہت اچھے اور خاندانی تھے۔ ثاقب کے متعلق بھی عمومی رائے بہت اچھی تھی۔ جنید بھائی چاہتے تھے کہ خزران اس مرتبہ سوچ بچار سے کام لے۔ خزران نے انہیں تو ہاں کہہ دی' لیکن فون بند کرنے کے بعد ذرا برابر توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ جب طے کرلیا کہ شادی نہیں کرنی تو بلاوجہ کیوں دماغ پہ بوجھ ڈالوں۔۔۔



وہ چھٹی لے کر لاہور آئی ہوئی تھی۔ پہلا دن تو اس نے خوب آرام کرتے گزارا۔ اگلے روز بھابھی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلنے کا پروگرام تھا' لیکن وہ دونوں ہی بچوں کو ہرگز ساتھ لے جانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ بھیا نے بھی آفس جانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ بچوں کو فضہ بھابھی کے پاس چھوڑا جائے۔ جاتے وقت تو دونوں نے کھڑے کھڑے ہی بچوں کو چھوڑا' لیکن واپسی پر آئے تو فضہ بھابھی نے زبردستی دوپہر کے کھانے پر روک لیا۔ بلکہ کھانا وہ تیار کرچکی تھیں۔ سیدھے انہیں دسترخوان پر لا بٹھایا۔

"ارے بھابھی! آپ نے تو اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا۔" خزران بری طرح شرمندہ ہوگئی۔ انہوں نے بریانی' کباب' قیمہ' سبزی جانے کیا کچھ بنا ڈالا تھا۔

"تم کون سا روز روز آتی ہو۔ پھر ہمارے گھر تو اور بھی کم کم آنے لگی ہو۔" سنجیدہ پھپھو نے شکوہ کناں لہجے میں کہتے ہوئے اسے دیکھا۔

"اچھا۔۔۔ اور سکینہ پھپھو یہ شکوہ کرتی ہیں کہ میں آپ کی طرف زیادہ آتی ہوں۔ ویسے اب تو لاہور ہی کم کم آتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"گجرات اتنی دور بھی نہیں کہ تم مہینوں بعد چکر لگاؤ۔ پتا نہیں کب یہ بوڑھا وجود ٹھنڈا ہوجائے۔

صورت تو دکھا جایا کرو۔" پھپھو کے مایوس' افسردہ لہجے پر خزران نادل منتھی میں آگیا۔

"ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں پھپھو۔۔۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ اماں کے بعد میں آپ میں اور سکینہ پھپھو میں اماں کو دیکھتی ہوں۔" اس نے جذباتی ہو کر ان کا ہاتھ تھاما۔

"ماں بھی کہتی ہو اور دل میں ناراضی بھی رکھتی ہو۔" پھپھو ہولے سے مسکرائیں تو خزران چونک گئی۔

"کیسی ناراضی پھپھو۔۔۔ میں تو۔۔۔"

"تمہارے اور عازم کے حق کے لیے برسوں پہلے اگر تمہارے پھوپھا کو منا لیتی تو بھائی جان تمہارا رشتہ یا سرے، تو نہ کرتے۔۔۔ لیکن سب میری کوتاہی ہے کہ محض ایک دکان کے لیے تمہارے پھوپھا کو راضی نہ کر سکی۔۔۔ تم تو دربدر ہوئیں ہی۔۔۔ آج میرا عازم بھی اپنا درد دل میں چھپائے اکیلے زندگی گزار رہا ہے۔" انہوں نے ایک آہ بھر کر کہہ ہی دیا۔ خزران خاموشی سے بچوں کے لیے کھانا نکالنے لگی۔

"سارہ کی شادی کے بعد تو عازم اور بھی ٹوٹا ہوا لگتا ہے۔"

"سارہ کی شا۔۔۔" خزران نے بے تحاشا چونک کر سر اٹھایا۔

"سارہ کی شادی ہو گئی۔۔۔؟" وہ آنکھیں پھیلائے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں سمیعہ نے نہیں بتایا۔" فضہ بھابھی حیران ہو کر سمیعہ کو دیکھنے لگیں۔

"میں نے تو جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ میں نے سوچا۔ کہیں یہ سمجھے کہ سارہ کی شادی کا بتا کر شاید اسے دوبارہ عازم کے لیے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"ہوں!" فضہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"اس کی شادی کو تو دو ماہ ہو گئے ہیں۔ اس کی والدہ کا دور کا رشتہ دار ہے۔ آج کل ملتان میں ہوتی ہے۔ وہاں اس کا سسرال ہے۔ پچھلے دنوں ایک شادی کے فنکشن میں ملاقات ہوئی۔ خوش اور مطمئن لگ رہی تھی۔"

فضہ بھابھی خود ہی دھیرے دھیرے بتانے لگیں۔ سب خاموشی سے بنا کوئی تبصرہ کیے سنتے رہے۔ خزران کی حالت تو سوا تھی۔ ایسی دھماکا خیز خبر پر اس کی سوچیں عجیب بے ربط اور اوندھی سیدھی ہو رہی تھیں۔

"میرا عازم بہت بدنصیب ہے۔۔۔ بچپن میں جتنا میرا لاڈلا ہوا کرتا تھا۔ آج قسمت نے اسے اتنا ہی دور اور اکیلا کر دیا ہے۔۔۔ پردیس کی سختیاں بھی اسی کے نصیب میں لکھی تھیں اور اب یہاں ہے تو دو گھڑی مہمانوں کی طرح بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی خاموشی سے میرا دل چھلنی ہوتا ہے۔ اتنا صابر شاکر تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ ضد اور غصے سے بات منوانے والا آج میرے سامنے اپنا دل کھولنے کو بھی تیار نہیں۔"

وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئیں۔ عجیب سی اداسی ماحول میں در آئی تھی۔ خزران نے خود کو بولنے سے باز رکھا۔ کہتی بھی کیا۔

وہ کافی بوجھل دل لیے پھپھو کے گھر سے واپس آئی۔ شام کو جنید بھیا یہی موضوع لے کر اس کے پاس آ بیٹھے۔ وہ تو لاہور آنے سے پہلے ہی اس بات کی توقع کر رہی تھی۔

"تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں خزران۔۔۔ کوئی بڑی تبدیلی آئی تو زیادہ سوال جواب نہیں کریں گے۔"

"لیکن بھیا! ضرورت ہی کیا ہے کسی تبدیلی کی۔۔۔ لگی بندھی نوکری ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔ خدانخواستہ کسی کی محتاجی نہیں۔۔۔ کیوں میں بلاوجہ بچوں کو ذہنی بے سکونی کا شکار کروں۔" وہ کھل کر بولنے کے لیے تیار ہو گئی جان گئی کہ بھیا کافی سنجیدہ ہیں۔

"تمہارے لیے تمہارے بچے اہم ہیں' اس لیے مسلسل ان ہی کے حوالے سے سوچ رہی ہو۔ میرے لیے تم بھی اہم ہو۔ میں بچوں سے پہلے تمہیں دیکھتا ہوں۔ آج امی اور ابا زندہ ہوتے تو شاید تمہاری کہیں شادی بھی کروا چکے ہوتے۔ اگر تم نے یونہی زندگی گزار دی تو بہت بڑا خلا رہ جائے گا تمہاری زندگی میں۔ جس کا

ابھی تمہیں احساس نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے، دیکھو تو شریعت کا بھی یہی حکم ہے کہ بیوہ اور مطلقہ کا فیصلہ جلد سے جلد کردو۔" وہ اسے رسان سے سمجھانے لگے۔

"سارہ کے والدین نے طلاق کے محض سات' آٹھ ماہ بعد اس کی دوسری شادی کردی' کون ماں' باپ چاہیں گے کہ ان کی اولاد دکھی رہے۔ اب دیکھو جونہی تبدیلی آئی ماشاء اللہ وہ خوش باش ہے اور عازم کو دیکھو' کیسا اکیلا اور خاموش سا ہوگیا ہے۔" بھیا جانے کیوں عازم کے موضوع پر آگئے۔ خزران سے چپ نہیں رہا گیا۔

"اچھا ہے' اسے تو سزا ملنی ہی چاہیے۔ بے قصور بے چاری سارہ کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آج اگر سارہ نئی زندگی میں خوش ہے تو یہ اللہ کی کرم نوازی ہے اس پر۔ بندے دلوں سے کھیل جاتے ہیں' اوپر والا تو شکر ہے انصاف کرتا ہے۔"

وہ ناراض لہجے میں بولنے لگی۔

"اچھا بابا۔۔۔" جنید ہنس پڑا۔ "اب تم سے کون بحث کرے۔ میں تو ویسے بھی تم سے ثاقب حسن کی بات کرنے آیا تھا۔۔۔ بہتر ہوگا کہ اپنے معاملے میں ہر پہلو پر غور کرو۔ خود ثاقب کی بہنوں بلکہ ثاقب سے بھی بات کرسکتی ہو۔ تم اب زندگی کی اس سنجیدہ اسٹیج پر ہو کہ ڈائریکٹ بات کرنے کو کوئی بھی تمہاری بولڈنیس سے تعبیر نہیں کرے گا۔ میں نے ثاقب کو تمہارا نمبر دے دیا ہے۔ وہ تمہیں فون کرے گا۔ کیوں سمیعہ۔" انہوں نے بھابھی کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل۔۔۔ ویسے بھی سنا ہے کہ ثاقب بہت سلجھا ہوا بندہ ہے۔"

"میں سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ سر جھکائے ان کی ہر بات سن رہی تھی۔ ہولے سے بس اتنا کہہ پائی۔

☆ ☆ ☆

"ماما! آپ کو میری کلاس ٹیچر نے بلایا ہے۔" مناہل نے جوتے اتارتے ہوئے کافی سکون سے اطلاع دی لیکن خزران کا تو دل دھک سے رہ گیا۔

"کیوں ایسا کیا کردیا؟"

"اس کی ٹیچر نے مجھے بلایا تھا کلاس میں۔" رافع نے غٹاغٹ پانی کا گلاس چڑھا کر اطلاع بہم پہنچائی تو خزران سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میم ناجیہ کہہ رہی تھیں' مناہل لائق تو بہت ہے۔ لیکن اس میں کانفیڈنس نہیں ہے۔ اسمبلی کی ایکٹوٹیز میں حصہ نہیں لیتی' کلاس میں زیادہ بولتی بھی نہیں ہے۔ اور خود سے سوال بھی کبھی نہیں کرتی۔ بونڈو کہیں کی۔" آخر میں وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا اور اس کی چھوٹی سے چٹیا زور سے کھینچ ڈالی۔ مناہل بے چاری کی چیخ نکل گئی۔

"مت کرو رافع! کیا بدتمیزی ہے۔ جاؤ یونیفارم چینج کرو۔ چلو بھاگو۔" خزران نے زبردستی اسے اندر دھکیلا۔

"ادھر آؤ منو!" اس نے پیار سے مناہل کو گود میں بٹھایا۔ چھ سال کی معصوم سی اس کی بچی۔ پتا نہیں کیوں اتنی سہمی سہمی سی رہتی تھی۔

"ماما! میرے فادر کون ہیں؟" مناہل نے اچانک پوچھا تو وہ بری طرح چونکی۔

"کیا مطلب۔ کس نے پوچھا تم سے۔؟"

"میم کہہ رہی تھیں۔ آپ کی ماما اگر بزی رہتی ہیں' تو آپ اپنے فادر کو بھیج دیں' رافع نے انہیں بتایا کہ ہماری ماما کالج میں پڑھاتی ہیں۔ اور ہمارے فادر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" مناہل نے ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ جانے کا اشارہ بھی کیا۔ خزران نے پریشانی سے لب کاٹے۔ اس دوران رافع کمرے میں واپس آچکا تھا۔

"تمہیں ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا رافع!"

"ماما! یہ تو پاگل ہے۔" رافع نے سر پیٹنے کی اداکاری کی۔ "میں نے میم کو تھوڑی ایسا کہا۔ وہ تو گھر آتے ہوئے یہ مجھ سے پوچھنے لگی تو میں نے اس کو بتایا۔ میم سے تو میں نے صرف "جی اچھا" کہا اور بس۔" وہ سیانوں کے انداز میں بتانے لگا تو خزران کو ہنسی آگئی۔

"واہ۔ میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' کس نے تم سے کہا کہ تمہارے فادر ہمیں چھوڑ گئے

ہیں۔"

"وہ تو مجھے کب سے پتا ہے۔ جب ہم دادی کے گھر رہتے تھے۔"

"ہوں!" خزران نے اسے قریب بٹھایا۔ "تمہیں اپنے فادر یاد ہیں۔"

"ہاں' تھوڑے سے۔ ان کی بڑی سی پکچر ہمارے کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ اور ایک بار وہ آئے بھی تھے۔ میری واٹر گن لائے تھے اور ہم جلو پارک گئے تھے ان کے ساتھ۔"

وہ اپنی یادداشت میں سے جن باتوں کو نکال رہا تھا وہ یاسر کی اس آخری چھٹی کی تھیں' جب وہ طلاق دینے سے کوئی پانچ' چھ ماہ پہلے آیا تھا۔ تب رافع ساڑھے پانچ سال کا اور مناہل ساڑھے تین سال کی تھی۔ مناہل کو تو وہ یاد بھی نہیں تھا اور رافع کے ذہن پر بھی دھندلے دھندلے نقوش تھے۔ رات کو ان کے سو جانے کے بعد وہ ایک بار پھر بے سکون ہو گئی۔ نیند کہیں دور جا بھاگی تھی۔ آج پھر وہ تھی اور ان گنت سوچیں۔

"طلاق یافتہ عورت کے بچے دنیا والوں کو کیا جواب دیتے ہوں گے کہ ہمارا باپ کہاں ہے۔"

"کیا میرے بچوں کے لیے باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کیا بھیا صحیح کہتے ہیں کہ نا سمجھی کی اس عمر میں ان کے لیے کسی مرد کو باپ کے روپ میں اپنا لینا آسان ہو گا۔ یہاں کئی ایک کولیگز جواب بہت اچھی دوست بن چکی تھیں اور اس کی ذاتی زندگی کے متعلق جان چکی تھیں۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ یہی مناسب وقت ہے وہ کسی اچھے اور بھروسے مند انسان کو اپنی زندگی میں شامل کر لے۔

"اچھا اور بھروسے مند۔" خزران نے ایک آہ بھری۔ "کبھی ان دو خصوصیات پر صرف عازم ہی پورا اترتا تھا۔ لیکن کیسی ہوا چلی تھی۔ اس نے تو جب قدم قدم چلنا سیکھا تب بھی عازم کی ہی انگلی تھامی۔ بچپن کی شرارتیں' لڑکپن کے لڑائی جھگڑے اور نوجوانی کا وہ نیا نیا محبت کا سفر' سب مرحلے اس کے ساتھ طے کیے تھے۔

اپنا مستقبل' بچوں کا مستقبل' کوئی مستقل ٹھکانا' کسی کا سہارا۔ عازم کا پریشان کر دینے والا رویہ۔ سب گڈمڈ ہونے لگے۔

عازم نے سارہ کا دل توڑا تھا۔ اس نے سارہ کے ساتھ وہی کیا تھا جو یاسر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ نہیں میں عازم کو قطعاً" معاف نہیں کروں گی۔ بتا دوں گی اسے کہ خود غرض انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اور تم میں خود غرضی بھی ہے' انسانیت کا فقدان بھی۔

اگلی صبح اس نے سمیعہ بھابھی کو فون کیا تھا اور ثاقب کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ ثاقب کے معاملے میں اس نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اب وہی جانے' اس بار اس کے حصے میں خوشیاں ڈالنی ہیں یا پھر کوئی امتحان...!



شاور کی تیز آواز میں اسے ایک بار گیٹ بجنے کا وہم سا ہوا تھا۔ باہر آ کر جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بال سلجھا رہی تھی' ایک مرتبہ پھر بیل بجی۔ وہ برش ہاتھ میں لیے دوپٹا کندھوں پر پھیلاتی باہر آ گئی۔

"کون؟" اس نے پوچھنے کے ساتھ ہی تھوڑا سا گیٹ کھولا۔

"عازم حیدر!" خزران کا ہاتھ وہیں رہ گیا اور عازم گیٹ کے بیچوں بیچ آ کر ٹھہر گیا۔

"اندر آ سکتا ہوں؟"

عازم بنا جواب کا انتظار کیے اندر آ گیا۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" وہ گھبرا کر اس کے پیچھے آئی۔

"اندر چل کر بتاؤں گا۔ کافی لمبا سفر کر کے آیا ہوں۔ بری طرح تھک چکا ہوں۔ بھوکا بھی ہوں۔" وہ آرام سے برآمدہ عبور کر کے بڑے کمرے میں آ گیا۔ خزران تیز قدموں سے اس کے پیچھے پہنچی۔ اس نے کچن میں آ کر پانی کا گلاس بھرا اور خاموشی سے عازم کو تھما دیا۔ وہ اس دوران صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

"تھینکس۔" اس نے گلاس لے کر ایک ہی

سانس میں چڑھالیا اور تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے پیشانی ملنے لگا۔

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں۔ یونہی کہہ رہا تھا۔" وہ ایک دم سنجیدہ سا فرش کو گھورے جارہا تھا۔

"چائے بناتی ہوں۔"

"مجھے نہیں۔" عازم نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ جانے نظریں کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایک بار بھی خزران کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ صوفے پر ہلکا سا ٹک کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ خزران نے کچھ بھی خود سے نہ پوچھنے کی جیسے قسم کھالی۔

"بہت خوش ہو نئے رشتے سے؟" عازم نے اپنی سرخ سرخ شکوہ بھری نگاہ سے پھر کو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خزران کا دل تو بڑی زور سے دھڑکا لیکن بنا کوئی جواب دیے نیچے دیکھتی رہی۔

"تباہ کر کے چھوڑو گی مجھے؟" صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے بیٹھا تھا۔ خزران گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ ایسی صورت حال کا تصور کیا تھا نہ اس کے سوالوں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار۔ کیا کہتی۔

"مزید برباد ہونے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ جان سے ماردو' پھر کرلو مزے سے شادی۔ جہاں دل چاہے۔"

وہ اچانک ہی عین اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ نہایت قریب سے اس کی زبان نے شعلے اگلے تو خزران کا دل چڑیا کی طرح سہما۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ عازم نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ کر پوری طرح اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ خزران نے کانپتی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ وہ آگ برساتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوئی لیکن دیوار سے ٹکرا گئی۔

"مجھ سے شادی کے لیے انکار کیا تو میں سمجھا شاید بچوں کی خاطر عمر بھر اکیلے گزارنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اس ثاقب حسن میں کون سے ہیرے جڑے ہیں جو شادی کے لیے رضامند ہوگئیں۔ کون لگتا ہے وہ تمہارا۔ کب سے جانتی ہو اسے۔؟" وہ اس وقت بالکل جنونی سا ہو رہا تھا۔

"نن۔ نہیں جانتی اسے۔ کبھی دیکھا تک نہیں۔ تت۔ تم بات تو سنو عازم!" وہ ایک دم رو دینے والی ہوگئی۔ موٹی موٹی آنکھیں پانی سے لبریز تھیں۔

"بکو۔ کیا کہنا ہے۔" وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ سمجھ گیا کہ خزران اس کے غصے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پارہی۔

"میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ جنید بھیا کے توسط سے رشتہ آیا تھا۔ بھیا کی خواہش ہے کہ میں شادی کرلوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں ساری زندگی اکیلے گزاردوں۔" خزران نے خود کو نارمل کر کے جواب دینے کے قابل بنایا۔

"ہاں تو سب یہی چاہتے ہیں اسٹوپڈ! کہ تم شادی کرلو۔ پھر مجھے چھوڑ کر ثاقب کیوں؟" وہ زچ ہو کر پھر سے اونچا بولنے لگا۔

"نہیں کرنی تم سے شادی۔" وہ بھی جھنجلا گئی۔ "تم سب جانتے ہو' پھر کیوں انجان بن رہے ہو۔"

"کیا خاک جانتا ہوں میں۔ سمیعہ بھابھی اور جنید کے ذریعے انکار اماں تک پہنچادیا۔ وجہ کیا تمہارے فرشتے آکر بتا گئے مجھے؟" وہ برس پڑا۔

"جانتی ہوں عازم! کہ تم مجھے بہت بے وقوف سمجھتے ہو۔" وہ ایک دم طیش میں آگئی۔ "لیکن اس بھول میں مت رہنا کہ میں تمہارے دل کی بات نہیں جان سکتی۔ مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔" وہ سب بھول بھال جیسے جنگ پہ آمادہ ہوگئی۔ "تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ سارہ کو طلاق دے کر تم میرا رشتہ مانگو گے اور میں ہامی بھرلوں گی۔ یاسر نے مجھے ایک عورت کی وجہ سے چھوڑ دیا اور تم نے .... تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے سارہ کو طلاق دے دی۔ کیا تماشا سمجھ رکھا ہے ہم عورتوں کی زندگی کو۔" وہ پوری شدت سے چلائی' لیکن اس سے بھی زیادہ شدت سے عازم کا طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔

"شٹ اپ!" وہ آگ بگولا اسے دیکھ رہا تھا۔

خزران حیرت اور صدمے سے گنگ دیوار سے لگ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ عازم پلٹ کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اپنی حرکت پر سخت پشیمانی محسوس کرتے ہوئے وہ اب لب چبا رہا تھا۔ بالکل ہی بے ساختہ ہاتھ اٹھ گیا تھا۔

عازم نے ایک نظر خزران کو دیکھا۔ وہ چہرا ہاتھوں میں دبے ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر رک کر سوچا پھر کچن میں آکر پانی کا گلاس بھرا اور واپس آیا۔ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر نرمی سے اس کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے اور گلاس آگے بڑھایا۔

"آئی ایم سوری رازی! ویری سوری۔ پانی پی لو۔" اس نے خود ہی گلاس خزران کے منہ سے لگایا۔ اس نے ایک گھونٹ پی کر رخ پھیر لیا۔

"چلو اٹھو یہاں سے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگا تو خزران خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

عازم اب اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"ملائیشیا سے آنے کے بعد میں نے کئی مرتبہ تم سے کہا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنے پرسنل شیئر کرنا چاہتا ہوں لیکن تم۔" وہ ذرا دیر کو رکا "بس یہی تھی ہماری انڈر اسٹینڈنگ اور ایک دوسرے کو جان لینے کے دعوے کہ میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو تم نے اسے گمراہ کرنے اور بہکانے سے تعبیر کیا۔ بس اتنا ہی جانتی ہو مجھے۔ لیکن اب......" اس نے انگلی اٹھا کر حتمی لہجے میں سیدھا خزران کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اب میں جو کہوں۔ چپ چاپ اپنے کان کھول کر سنو۔ بیٹھو یہاں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے جا کر بیٹھ گئی اور عازم بھی عین اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر ٹک گیا۔

"اب شروع سے سنو احمق لڑکی! کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا جسے تم تک پہنچانے میں مجھے دو سال لگ گئے۔ بلکہ تب جب میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ بہت سے کام جو میں تم جیسی مخلص اور ہمدرد کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا جو مجھے اکیلے اپنے بل پر بے پناہ رسک لے کر کرنا پڑ گئے۔ جہاں تک تمہاری بات ہے تو بھول جاؤ کہ اب تم میرے علاوہ کسی اور کی ہو سکتی ہو۔" وہ کچھ اور کہتے کہتے اچانک رکا۔ "خیر! اس پر بعد میں بات کریں گے۔" وہ شاید ایک بار پھر جذباتی ہونے لگا تھا لیکن خود ہی اپنے آپ کو روکا۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"سارہ کو طلاق دینے کا فیصلہ میں نے ملائیشیا میں ہی کر لیا تھا۔ بہت پہلے۔" اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا اور خزران پہلے ہی جملے پر چونک گئی۔

"بہت پہلے کیوں؟"

"میں ہمیشہ کے لیے ملائیشیا چھوڑ کر دوبارہ پاکستان آیا' صرف اسی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے۔ میں نے اپنی لگی بندھی بہت عمدہ جاب چھوڑ دی۔ کیونکہ پاکستان آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ البتہ سارہ میرے ایسے کسی منصوبے سے قطعاً لاعلم تھی بلکہ اسے اب تک نہیں پتا تھا کہ ہماری علیحدگی کے پیچھے اصل وجہ کچھ اور تھی۔ مجھے تم سے یہ سب شیئر کرتے ہوئے بہت ہمت درکار ہے خزران! شاید کچھ معاملات میں مرد ہوتے ہی تنگ نظر اور روایتی ہیں۔ میں بھی عام مردوں سے مختلف تو نہیں ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے بہت کچھ کہنے کو تیار لگا۔

"جب تمہاری یاسر سے شادی ہوئی' میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر غم کا کیسا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ ایک سال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں جھولتا رہا۔ تمہاری جدائی کے صدمے کو جھیلتے جانے کب دمے کا مریض بن گیا' پتا ہی نہیں چلا۔ کھانستے کھانستے سینہ چھلنی ہو جاتا اور میں بے دم ہو کر گر پڑتا۔ کبھی کبھی یہ حالت ہو جاتی کہ مصنوعی آکسیجن دلانے کے لیے آدھی رات کو دوست ایمرجنسی میں لیے پھرتے۔ جیسے تیسے ایک سال گزرا اور میں پہلی چھٹی پر پاکستان آیا۔ اماں اور ابا کو یہ شک بھی گزرا کہ شاید میں نشے کا عادی ہو چکا ہوں۔ لیکن جب میں نے طبیعت کا بتایا تو انہوں

نے میرے۔ مسئلے کا حل شادی نکالا اور دونوں دنوں میں نہ صرف سارہ سے رشتہ بلکہ شادی بھی انجام پا گئی۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ پہلے دن سے ہی میں نے سارہ کو اپنی پلکوں پہ بٹھا لیا تھا یا پہلی ہی نظر میں وہ میرے دل میں سما گئی تھی۔ مجھے اس کا عادی ہونے میں کچھ وقت لگا تھا لیکن میں نے اس پر کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنی اچھائیوں کی بدولت میرے دل میں جگہ بناتی گئی۔ بظاہر تو سب کچھ بہت نارمل انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن میری بدنصیبی نے شاید میرا پیچھا نہ چھوڑنے کی قسم کھا لی تھی۔

ہماری شادی کو تین برس گزر گئے تھے' لیکن ابھی تک اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو حالانکہ ابھی یہ معاملہ زیادہ سنجیدہ نوعیت کا نہیں لگا لیکن سارہ کو کافی تشویش لاحق تھی۔ میں اس سے کہتا ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے' لیکن وہ میری ایک نہیں سنتی اور ڈاکٹروں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ تقریباً سب ہی ڈاکٹرز نے ہم دونوں کے ٹیسٹس تجویز کیے لیکن میں اپنی آفس ٹائمنگ اور کچھ سستی یا لاپروائی کہہ لو کہ اس کام کے لیے وقت نہیں نکال پایا اور وہ اپنی ٹریٹ منٹ وغیرہ میں مگن رہی۔

پانچویں سال کہیں جا کر سارہ کے انتہائی فورس کرنے پر بالآخر میں نے اپنا ٹیسٹ کروایا تو یہ بری خبر بم بن کر ہم دونوں پہ پھٹی کہ پرابلم مجھ میں ہے۔ شروع شروع میں' میں نے علاج وغیرہ کو کافی سنجیدگی سے لیا' اور متواتر کئی ٹیسٹ کروانے کے بعد رپورٹ میں بہتری کے آثار بھی دکھائی دیے' لیکن اولاد کی خوشی پھر بھی' نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ سارہ اب بہت مایوس اور ناامید رہنے لگی تھی۔ اسے تو کسی علاج کی ضرورت تھی نہیں' اس نے بس عبادت اور وظائف وغیرہ کا سہارا لے لیا۔ لیکن علاج اور دعاؤں کا بھی کوئی نتیجہ نہ پا کر وہ پھر مایوسی میں ڈوبنے لگی۔

وہ اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لینے لگی تھی کہ شاید اب یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔ سر درد اور ہائی بلڈ پریشر جیسے اسے چپک ہی گئے تھے۔ وہ فرسٹیٹڈ ہو کر مجھ پر بھی چلانے لگی تھی۔ کبھی گھنٹوں ——— روتی۔ اسے بہلانے کے لیے میں نے ہر سہولت گھر میں مہیا کی لیکن اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں اس کا ذہن بٹانے کے لیے ہوٹلوں' اور تفریحی مقامات پر لے جاتا' فلمیں دکھاتا لیکن وہ ہر جگہ غائب دماغ ہی رہتی۔ نہ اسے کسی اور چیز میں دلچسپی تھی نہ کسی قسم کا شوق اور لگن دکھائی دیتا۔ میں سخت پریشان تھا۔ اسے نارمل رکھنے کی ہر تدبیر بے کار گئی تھی۔ وہ زندہ تھی' لیکن زندگی کی رنگینی و رعنائی سے قطعاً" عاری۔

ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے وہ پیار بھی کرتی تھی' میرا خیال بھی رکھتی تھی' اور کبھی کبھی اس بات پر حد سے زیادہ پشیمان بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنے رویے سے میرا دل دکھا رہی ہے۔ کبھی وہ بچے کے لیے روتی تو کبھی میرے لیے۔ کوشش تو کرتی تھی کہ اپنا دکھ مجھ سے چھپا لے' لیکن ناکام رہتی کیونکہ بے اولادی کا دکھ اکثر ہی میری محبت پہ حاوی ہو جاتا۔ میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر ایک' مرتبہ پھر سنجیدگی سے اپنا علاج شروع کر دیا لیکن ڈاکٹرز سے تفصیلی ڈسکشن کے بعد یہی سمجھ میں آیا کہ کامیابی کے چانسز بیس یا پچیس فیصد ہیں۔ یعنی ایک موہوم سی امید پر ہم مزید کئی سال بچے کی راہ دیکھیں اور اس کے نتیجے میں بھی معلوم نہیں کامیابی نصیب ہوتی یا نہیں۔

ادھر سارہ کے لیے "انتظار" ایک تکلیف دہ لفظ بن گیا تھا۔ میں نے سارہ سے کہا کہ ہم بچہ گود لے لیتے ہیں۔ فضہ بھابھی ان دنوں امید سے تھیں' اور میں نے عرفان بھائی اور بھابھی سے بات بھی کر لی تھی۔ دونوں اپنا تیسرا بچہ ہمیں دینے کے لیے تیار تھے۔ لیکن سارہ نے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر کسی اور کا بچہ نہیں پالے گی۔

اس وقت پہلی بار میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب ہماری اپنی اولاد ہونے کے چانسز انتہائی کم ہیں اور سارا کسی اور کا بچہ بھی گود لینے کو تیار نہیں تو پھر سارا کی بیماری اور

پریشانی کا تیسرا حل کیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے روایتی انسانی رویوں پر بہت حیرت ہوتی ہے یا شاید میں ہی دنیا سے انوکھا ہوں۔ سارہ سے مجھے ویسے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن بچہ گود لینے کے معاملے پر اس کا جو رویہ تھا، اس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اگر عیب سارہ میں ہوتا تو بچہ گود لینے کا یہی مشورہ اس کی طرف سے آتا۔ تب بے اولادی کے دکھ پر شوہر کی دوسری شادی کی پریشانی جاری ہو جاتی اور عدم تحفظ کا احساس سب سے پہلے اسے بچہ گود لینے پر اکساتا، لیکن خیر۔" عازم نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اس کی سوچ پر میں نے اسے معاف کیا۔

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ میں آفس میں تھا اور سارہ گھر پر اکیلی۔ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی ہو گیا۔ میں گھر آیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں فوری طور پر اسے اسپتال لے گیا۔ اس دن میں یہ سوچ کر بہت پریشان ہوا کہ اگر اکیلے میں خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو میں شاید زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر پاتا۔ اس کے بعد اگرچہ اس نے بلڈ پریشر کی دواؤں کا ریگولر استعمال شروع کر دیا تھا۔ جس سے خطرے کا امکان کم ہو گیا لیکن اس کی ذہنی پریشانی جوں کی توں تھی۔ میں نے پاکستان واپسی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

میری پہلی کوشش یہ تھی کہ سارہ کو اکیلے پن سے نجات دلائی جائے۔ بھائی بہنوں، ملنے جلنے والوں میں وقت گزار کر یقیناً" وہ نارمل لائف گزارنے کے قابل ہو سکتی تھی۔ اور وقتی طور پر وہ بہل بھی گئی، لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ ڈیڑھ، دو ماہ ہی کامیابی سے چلا اور میں سمجھ گیا کہ سارہ کی زندگی کا خلا اس حقیقی خوشی سے ہی پورا ہو سکتا ہے، جو میں اسے نہیں دے سکتا۔ تب جی کڑا کر کے دوسرے مرحلے پر میں نے اپنا رویہ اس کے ساتھ تبدیل کیا۔ میرا ارادہ روز کے لڑائی جھگڑوں سے آغاز کر کے نوبت علیحدگی تک لانا تھا۔

دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارہ کو حقیقت بتا کر پلان کر کے طلاق دوں۔ اس طرح وہ عمر بھر اپنے ضمیر کی مجرم رہتی۔ وہ دوسرے، گھر خوش رہ پاتی اور نہ اولاد پا کر سچی خوشی حاصل کر سکتی۔ ساری عمر یہ سوچ کر نادم رہتی کہ اس نے میرا دل توڑ کر اولاد پائی ہے۔ اب بھلا کسی کو ادھوری خوشی دینے کا کیا فائدہ۔ بہتر تھا کہ وہ پوری طرح مجھ سے بدظن ہو جاتی۔ اس لیے میں نے سنگ دل شوہروں جیسا رویہ اپنا لیا۔ جس پر وہ دن رات یہ سوچنے لگی کہ ایک تو کمی بھی عازم میں ہے اوپر سے رویہ بھی اسی کا برا ہے۔ میں آخر کس بنیاد پر اس کے ساتھ رہوں۔ اس نے مجھ سے بلا تردد علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح میرا منصوبہ کامیاب رہا۔

جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو مجھے ملائیشیا میں صرف اتنا پتا چلا کہ یاسر نے دوسری شادی کر لی ہے، وہ بھی لبنیٰ بھابھی کے بھائی حمزہ سے۔ سارہ نے مجھ سے یہ بات شیئر نہیں کی، حالانکہ اس کا یہاں سب سے رابطہ تھا۔ اسے یقیناً" پتا چلا ہو گا لیکن مجھے اس نے نہیں بتایا۔ مجھے یہاں آ کر فضہ بھابھی اور اماں سے یہ بات پتا چلی کہ یاسر نے تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کی ہے اور یہ بھی کہ تم ابھی تک سسرال میں رہتی ہو۔ بلکہ عین اسی دن پتا چلا جب میں لبنیٰ بھابھی کا پارسل لے کر تمہارے ہاں آیا تھا۔"

خزران نے کافی غائب دماغی سے عازم کے آخری جملے سنے۔ ذہن ایک ہی نہج پر سوچے جا رہا تھا۔ عازم کے انکشافات نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اتنی بڑی قربانی کوئی کیسے دے سکتا ہے۔

"سارہ کی دوسری شادی کا سن کر تمہیں کیسا لگا؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا تو عازم مسکرانے لگا۔

"خوشی ہوئی تھی سن کر۔ بس اللہ سے ایک ہی دعا ہے کہ اس نے سارہ کے نصیب میں اولاد کا سکھ لکھا ہو۔"

"کس کس کو پتا ہے عازم؟"

"کسی کو نہیں۔ میں نے کہا نا، مرد کچھ معاملوں میں بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ اپنے گھر، خاندان سے اسی لیے تو لعن طعن سن رہا ہوں۔ سب ہی کو لگتا ہے سارہ پر ظلم ہوا ہے۔ البتہ جب سے، اس کی شادی کا سنا

بے قدرے خاموش ہو گئے ہیں۔ اور ایک دن بھول بھال جائیں گے اور کیا۔"

وہ لاپرائی سے ہنسا تو خزران بغور اسے دیکھنے لگی۔ وہ جب کھل کر ہنستا تھا تو اس کی آنکھوں کے بیرونی سروں پر کنپٹی کے قریب تین تین لائنیں ابھر آتی تھیں۔ خزران ہمیشہ اسے کہتی عازم جب تم ہنستے ہو تو تمہاری آنکھیں بھی ہنستی ہیں۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے عازم کو غور سے دیکھا۔

"خود کو تنگ نظر مت کہو عازم! میں جانتی ہوں تم نے سب سے یہ بات کیوں چھپائی ہوگی۔" خزران نے قدرے توقف کے بعد لب کشائی کی۔

"اچھا!" وہ ہنسا۔ "تو مجھے جاننے والی حسیں بیدار ہونا شروع ہو گئیں؟"

"تمہیں پتا تھا کہ اگر تم نے عرفان بھائی یا پھپھو وغیرہ سے یہ بات شیئر کی تو وہ سب تمہیں اس اقدام سے روکیں گے۔ جبکہ تم تو سارہ کو ایک عظیم خوشی دینے کی ٹھان چکے تھے۔ یہ تمہاری تنگ نظری نہیں بلکہ اعلا ظرفی ہے کہ تم نے اس معاملے کو دنیا میں نہیں اچھالا۔ ورنہ احسان کر کے ڈھنڈورا پیٹنا تو عام رواج ہے یہاں کا۔"

"نہیں رازی!" عازم ایک آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس معاملے کو خود تک رکھنا اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ ہر کسی کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میرا اور سارہ کا معاملہ قدرے الگ تھا ورنہ طلاق ایسے مسئلے کا حل ہونا نہیں چاہیے۔ کئی بے اولاد جوڑے پوری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پورے اطمینان اور صبر و شکر سے گزار رہے ہیں۔ جو میرے ساتھ ہوا وہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ طلاق میاں بیوی کے کسی بھی معاملے کا آخری سے بھی اگلا آپشن ہونا چاہیے۔ طلاق جیسے ناپسندیدہ عمل کے متعلق یہ میری ہمیشہ سے رائے تھی لیکن افسوس کہ میری اپنی ہی زندگی اس حادثے سے دوچار ہو گئی۔"

"سارہ نے بھی رپورٹس وغیرہ کے معاملات کبھی کسی سے ڈسکس نہیں کیے۔ اس معاملے میں وہ بھی تعریف کی حق دار ہے۔" خزران ابھی تک معاملے کی باریکیوں میں کھوئی تھی۔

"ہاں۔ ہماری فیملی کی حد تک مانتا ہوں' اس نے کبھی کسی سے یہ بات شیئر نہیں کی۔ لیکن اس کی اپنی فیملی یقیناً" اس سے لاعلم نہیں تھی۔"

"تمہارا اندازہ ہے یا؟"

"تجربہ ہے۔ میرے، طلاق کے فیصلے کے بعد میرا خیال تھا کہ میرے سسرال کی طرف سے کافی شور ہنگامہ ہوگا لیکن جب اس طرف سے کوئی خاص منفی رد عمل سامنے نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس حقیقت سے یقیناً" واقف تھے۔ اللہ جلد سارہ کی گود ہری کر دے۔ تب تو ساری دنیا خود بخود جان جائے گی کہ پرابلم کہاں تھی۔"

وہ آخری جملے پر ہنسا تو خزران نے بہت اندر کہیں درد اٹھتا محسوس کیا۔ آنکھوں میں اچانک نمی سی تیر گئی۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

"کتنا بدگمان ہو گئی تھی میں عازم سے۔ یہ تو آج بھی وہی عازم ہے۔ ساری دنیا کا درد اپنے اندر محسوس کرنے والا۔ دوسروں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے' سوائے اپنے سب کے لیے جلنے کڑھنے والا۔ میرا عازم۔" وہ جذباتی سی ہو کر چند قدم آگے بڑھ کر اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"سوری عازم! میں سچ مچ تم سے بہت بدگمان ہو گئی تھی۔"

"ہاں اتنی کہ کسی اور کا ہاتھ تھامنے کو بھی تیار ہو گئیں۔" اس نے ہلکا سا طنز کیا۔

"مجھے دوسری شادی کی قطعاً" کوئی خواہش نہیں ہے عازم!" وہ ایک دم رونے والی ہو گئی۔ "بھیا بہت پریشر ڈال رہے تھے' ہر بار ایک ہی بات' مجھے لگا شاید دوسری شادی ناگزیر ہے۔" اس کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا۔ عازم نے بھرپور دلچسپی سے اس کی حالت پر نظر ڈالی۔

"دوسری شادی تو ناگزیر ہے محترمہ! یاد ہے میری آخری بات جو میں کہتے کہتے اس وقت رک گیا تھا۔" عازم نے کچھ دیر پہلے کا اپنا جملہ یاد دلایا لیکن وہ حیران

حیران اسے دیکھنے لگی۔

"ثاقب صاحب کی تو کسی سے بھی شادی ہو سکتی ہے لیکن اگر تم نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو سوچ لو کہ عمر بھر کے لیے اکیلا رہ جاؤں گا۔ سارہ نے میرے ساتھ سات سال کی اذیت اس لیے کاٹی کیونکہ میں اپنی پرابلم سے لاعلم تھا۔ لیکن اب جانتے بوجھتے کسی لڑکی کی زندگی کسی قیمت پر تباہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت صرف تم ہو' جس کا ساتھ میں قبول کر سکتا ہوں۔ اللہ تمہارے بچوں کو سلامت رکھے' تم اس دولت سے محروم نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری بدولت میرا گھر بھی ہرا بھرا ہو جائے گا۔" عازم نے وضاحت کی تو خزران نے سر جھکا لیا۔

"اور ہاں!" دو قدم مزید آگے آکر عازم نے انگلی سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ "ایک وجہ اور بھی تو ہے تمہارا ساتھ چاہنے کی۔ جو ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اس دنیا کے ہر جھنجٹ' ہر مسئلے سے اوپر' ہر شے پر حاوی اور مقدم۔ صرف میرے اور تمہارے درمیان۔"

وہ دھیمے لہجے میں نہایت رسان سے اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ خزران کی سانسیں تھمنے لگیں۔ وہ سامنے کہاں تھا وہ تو اس کے اندر بول رہا تھا۔ وہ دوسری وجہ جو عازم کے لبوں پہ تھی۔ صدیوں سے خزران کی نس نس میں بسی تھی۔ نہ اسے اظہار کی ضرورت تھی نہ وہ الفاظ کی محتاج تھی۔

"وقت کے ظالم ہاتھوں نے تمہیں بہت دور جاکر کھڑا کر دیا تھا رازی! میں بس مرا نہیں تھا تمہاری جدائی میں۔" وہ درد سے چور لہجے میں بولنے لگا۔ "تم سے دوری میں درد کی کن انتہاؤں کا چھوا ہے' لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یاسر نے تمہیں چھوڑا تو اپنے زندہ بچ جانے کا راز سمجھ میں آیا۔۔۔ اور ابھی میں قدرت کے رازوں کو معنی پہنانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھ سکتی ہو رازی! تو چلی جاؤ اس بار بھی منہ موڑ کر۔ تمہارے ہاتھوں آئی موت میں۔۔۔"

"بس کرو عازم!" خزران نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پہ اپنا کانپتا ہاتھ رکھا اور پھر اس کے شانے سے لگ کر بے تحاشا روئے چلی گئی۔

عازم کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ اماں سے خزران اور ثاقب کے رشتے کا پتا چلا تو کیفیت ہی کچھ مرنے جیسی ہو گئی تھی۔

عازم نے نرمی سے خزران کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے خود سے تھوڑا سا الگ کیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" عازم نے سینے پہ ہاتھ باندھ کر سہولت سے دیوار سے ٹیک لگائی۔

"کہو۔"

"میرا پروپوزل تمہیں قبول ہے نا۔۔۔؟"

"تمہارا پروپوزل۔۔۔!" خزران نے ناخن کھرچتے ہوئے پرسوچ انداز اپنایا اور لہجے کو سنجیدہ بنایا۔

"ایک ساتھ دو لوگوں کا پروپوزل کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ میرا رشتہ تو ثاقب سے ہو چکا۔۔۔" وہ اب چڑانے کے موڈ میں آگئی تھی اور عازم بھی سچ مچ غصہ کھا گیا۔

"تم ابھی تک اس ثاقب کی بات کر رہی ہو۔"

"میرا اس سے رشتہ طے ہوا ہے۔ ایسے کیسے کمٹ منٹ توڑ دوں۔" وہ مسکرانے لگی۔

"شرم تو نہیں آتی' بار بار اس کا نام لے رہی ہو۔۔۔ اور کمٹ منٹ کیسے ٹوٹتی ہے' ابھی بتاتا ہوں۔" عازم نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑی۔

"اف' چھوڑو عازم۔۔۔!" خزران نے کلائی چھڑوائی۔ "بالکل جنگلی ہو تم۔۔۔"

"اب لوگی اس کا نام۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"توبہ میری۔۔۔" خزران بھی مسکراہٹ نہ روک سکی۔ "اس کا معاملہ اب تمہاری دردسری ہے۔۔۔ میرا کیا لینا دینا۔" وہ سرخ چہرہ لیے نیچے دیکھ رہی تھی۔

عازم نے اندر تک سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

"یو آر سو سوئیٹ۔۔۔!" وہ دیوار سے ہٹ کر ایک جذب سے آگے بڑھا کہ عین اسی وقت شور مچاتے رافع اور منال کمرے میں وارد ہوئے۔ عازم نے اپنے قدم وہیں روکے اور بچے بھی ٹھٹک کر رک گئے۔

"ارے انکل! آپ۔۔۔!" رافع نے پہچان کر نعرہ لگایا۔

"بس باس۔۔۔!" عازم نے آگے بڑھ کر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے آپ لوگ۔ سنجیدہ دادی کتنا یاد کر رہی ہیں آپ دونوں کو۔" عازم نے مناہل کو پیار کیا۔

"آپ ہمیں لینے آئے ہیں۔۔۔؟" مناہل نے بیگ صوفے پر پھینکا اور تجسس سے سوال کیا۔

"جی بیٹا! ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" اس نے مناہل کو گود میں اٹھا لیا۔ "تم سے تو بچے بھی سمجھ دار ہیں۔" عازم نے ایک نظر مسکرا کر خزران کو دیکھا تو وہ اسے گھور کر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

عازم اپنی جیپ پر گجرات آیا تھا۔ خزران نے دو روز کی چھٹی کی درخواست دی اور دوپہر کا کھانا کھا کر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

"انکل! ہماری مما سے کہیں ناں۔۔۔ پورے ہفتے کے لیے وہاں ٹھہریں۔ تین دن سے کیا ہو گا۔" رافع نے گاڑی میں پرجوش انداز میں فرمائش کی تو عازم ہنسنے لگا۔

"بہت جلد آپ لوگوں کو پورے ایک ماہ کی چھٹی کرائیں گے۔ فکر کیوں کرتے ہو۔"

"اچھا انکل۔۔۔ وہ کب۔۔۔؟ رافع نے خوش گوار حیرت سے سوال کیا۔

"بتاؤ ناں، کب کی ڈیٹ فکس کریں۔۔۔؟" عازم نے ذرا سی گردن موڑ کر خزران کو دیکھا تو وہ تنبیہہ کے انداز میں اسے گھورنے لگی۔

"عازم! ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔" وہ ہلکی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ضروری ہے ڈیر۔۔۔ ہر کام سے بڑھ کر اہم۔ انہیں بچہ سمجھ کر ان سے کچھ شیئر نہ کرنا اور کوئی بڑا قدم اٹھا لینے کے بعد خود ہی فرض کر لینا کہ یہ ابھی بچے ہیں، انہیں کچھ سمجھ نہیں، انتہائی خطرناک بات ہے۔ بچے بڑوں سے کہیں زیادہ پر تجسس اور اردگرد پر نگاہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ میرے، تمہارے معاملے میں پوری دنیا ایک طرف اور یہ دو ایک طرف۔۔۔ بھلے پوری دنیا کی نفی کر کے میرا ہاتھ تھام لو پروا نہیں، لیکن ان دو کی۔ ہرگز ہرگز نہیں۔" اس نے بھرپور سنجیدگی سے انگلش میں کہا تھا اور جواباً خزران بھی قائل ہوتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

"ہاں بھئی، کہاں بزی ہو گئے؟" عازم نے دوبارہ رافع کی طرف دھیان دیا۔

"جی انکل۔۔۔!"

"آپ کو لاہور اچھا لگتا ہے یا گجرات۔۔۔؟"

"لاہور زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لاہور میں میرے بہت سے فرینڈز ہیں۔" خزران نے محسوس کیا کہ وہ عازم کے توجہ دینے پر بہت خوش ہو رہا تھا۔

"اچھا اور اپنی فیملی میں کس کس سے دوستی ہے۔" عازم نے گفتگو جاری رکھی۔

"فیملی میں۔۔۔" رافع نے پرسوچ انداز میں انگلی بجائی۔ "یسریٰ اور سندس تو گرلز والے گیم کھیلتی رہتی ہیں۔ عرفان انکل کے سنی اور شان سے میری بہت فرینڈشپ ہے، لیکن ماما وہاں بہت کم جاتی ہیں۔"

"آپ کو پتا ہے، میں سنی اور شان کے گھر میں رہتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔؟" رافع حیران ہوا۔ "مجھے پتا ہے آپ سنی اور شان کے چاچو ہیں۔ لیکن آپ کا گھر تو الگ تھا نا؟"

"آپ کی سنجیدہ دادی نے بلا لیا۔ وہ بیمار رہنے لگی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں آپ سب کو بھی ان ہی کے پاس لے آؤں۔" عازم نے اصل مدعے کی تمہید باندھی۔ خزران نے گھبرا کر تھوک نگلا۔

"آپ کے گھر؟" رافع نے اپنی چمک دار آنکھیں پھیلائیں۔ "لیکن ہم تو ہمیشہ جنید ماموں کے گھر جاتے ہیں۔"

"آپ کے جنید ماموں کا گھر کافی چھوٹا سا ہے۔ ماموں کے لیے کافی پرابلم ہے۔ دادی کا گھر بڑا بھی ہے۔